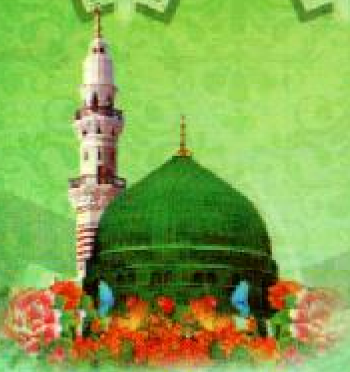

سوزِ دُروں

مثنوی مولانا رومؒ کی ایک تعبیر

عارف ملت فرید العصر شیخ طریقت
حضرت خواجہ ابو النصر منظور احمد شاہ
بانی و شیخ الحدیث جامعہ فریدیہ ساہیوال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں)

نام کتاب ------------ سوز درُوں

تالیف ------------ علامہ پیر ابوالنصر منظور احمد شاہ صاحب
بانی و شیخ الحدیث جامعہ فریدیہ ساہیوال

کمپوزنگ ---------- محمد ندیم فریدی

پروف ریڈنگ ---------- علی عمران قادری

تعداد ------------ ایک ہزار

اشاعت (باراول) ------- اگست 2015ء

مطبع ------------ فریدیہ پریس لیاقت چوک ساہیوال

ہدیہ ------------

ناشر:۔

مکتبہ نظامیہ ، جامعہ فریدیہ ساہیوال فون: 040-4466685

www.jamiafaridia.org.pk

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین	نمبر شمار
6	مقدمہ	1
6	عشق الٰہی	2
9	عشق ومحبت	3
10	عظیم نعمت	4
19	تصوف	5
21	تصوف کے بارہ میں غلط فہمی	6
23	صوفی	7
24	فلسفۂ عشق	8
28	نظریہ وحدت الوجود	9
33	مولانا رومی اقبال کی نگاہ میں	10
35	مثنوی شریف	11
37	مولانا رومی کا مختصر تعارف	12
41	غور وفکر سے پڑھا جائے	13
43	آغاز مثنوی	14
87	رعایت ادب کی توفیق کی خواہش اور بے ادبی کی مذمت	15
195	ایک یہودی بادشاہ کا واقعہ جو عیسائیوں کا قاتل تھا	16

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
17	عیسائیوں میں جنگوں کا آغاز	205
18	حسد کی مذمت	211
19	خلیفۂ وقت کا لیلیٰ سے سوال کرنا اور اس کا جواب	236
20	یہودی وزیر کے حسد کا بیان	251
21	پوری حکایت کا خلاصہ	269
22	**بکھرے موتی**	280
23	شیخ کامل سے وابستگی	280
24	مقام فنا	281
25	مقام ولائیت	282
26	شیخ کامل کی صحبت	282
27	روحانی پرواز کیلئے تقویٰ شرط	283
28	اہل اللہ سے دوری خدا سے دوری ہے	284
29	اللہ والوں کو اپنے جیسا نہ سمجھ	285
30	اللہ والوں کی حاضری	287
31	شیخ کامل دور نہیں ہوتا	288
32	خدا کی ہم نشینی	289
33	اولیاءاللہ دِلوں کے راز جانتے ہیں	290
34	نور مومن کی عظمت	292

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
35	نفس دشمنی میں قرب الٰہی ہے	293
36	نفس پر قابو پانے کے بعد	295
37	دنیا سے کنارہ کشی	296
38	صراط مستقیم کا سفر	298
39	حسد کی مذمت	299
40	خودنمائی	301
41	خدا کے ڈر سے رونا روح کی ترقی ہے	302
42	روح کی پرواز	304
43	مشائخ کی حاضری	305
44	میرا دل مرکز انوار کیوں نہیں؟	306
45	خاک سے افلاک تک	307
46	ذکر و فکرِ خداوندی	309
47	تلاش محبوب	311
48	دنیا کا قرب خدا سے دوری ہے	312
49	نفس کو ذبح کر دے	314

تمت بالخیر

مقدمہ

اللہ رب العزۃ جل مجدہٗ کی حمد وثنا حضور ﷺ کی ذات با برکات پر ہدیہ درودوسلام کے بعدرب قدوس جل مجدہٗ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، شدید مصروفیات کے باوجود تفسیر نورالقرآن مکمل ہوگئی اس کے بعد چند دن تک فارغ رہنے کا موقعہ ملا مگر عادتِ تحریر کے پیش نظر سکون نہ ملا، دل نے مشورہ دیا کہ تصوف کے میدان میں قلم اُٹھایا جائے، غوروفکر کے بعد یہی بات ذہن میں آئی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''مثنوی شریف'' کا مطالعہ کیا جائے، بارہا یہ ذہن میں آیا کہ اس میدان میں چلنا بہت مشکل کام ہے بہت ٹھوکریں لگنے کا اندیشہ ہے، گرنے کا ڈر ہے بہت سے لوگ ٹھوکریں کھا گئے بہرحال اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس دریا میں بھی چھلانگ لگادی، تیراک نہ ہونے کے باوجود یہ جرأت حیران کن تھی، بالآخر ''ومن یتوکل علی اللّٰہ فھو حسبہ '' کے ارشاد سے حوصلہ ہوا اور قلم اُٹھالیا۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے اندازفکر کے پیش نظر اس کتاب کا نام ''درس مثنوی'' تجویز کیا ہے، میں نے اپنی ساری تالیفات کی طرح اس میں بھی اختصار، سادگی کوملحوظ رکھا ہے کہ بہت سے صوفیاء جو اس کا درس دیتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاسکیں۔

عشق الٰہی

حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے اسی عنوان پر خامہ فرسائی کی ہے کہیں حکایت کی شکل میں کہیں تمثیلات کے رنگ میں کہیں واقعات کی روشنی میں، مناسب سمجھتا

ہوں کتاب کے آغاز سے پہلے اس عنوان پر چند باتیں عرض کر دوں۔تصوف کی اصطلاح عشق سے مراد عشق الٰہی ہے یہی چیز دولت لازوال ہے یہی شرف با کمال ہے وہ عشق جو حقیقت تک نہ پہنچائے وہ اسرار معرفت کا ذریعہ قرار نہیں پا سکتا،اسی لفظ عشق کو قرآن مقدس نے لفظ محبت سے تعبیر فرمایا ہے عشق ہی وہ دولت ہے جو نا اُمیدی کو دھکیل دیتی ہے یہی دولت دل کی زندگی اور زندگی کی کامیابی ہے،محبت و عشق کا ایک عظیم ترین کمال یہ ہے کہ محبّ اپنے محبوب حقیقی کے جمال جہاں آرا سے بہرہ ور ہو اور اس منزل کو حاصل کرنے کیلئے جہات کی قید سے نکلنا ضروری ہے۔

عشق ہی وہ کمال ہے جو قیود سے آزاد کرتا ہے،اقبال مرحوم نے اس عنوان کو اپنے اس شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

کمال زندگی دیدار ذات است
طریقش استن زیں شش جہت است

روحانیت کا بلند ترین مقام فنافی اللہ ہے یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک انسان اپنی ذات وصفات کو کالعدم قرار نہ دے دے۔

معرفت خداوندی میں عقل حجاب بن جاتی ہے مگر عشق رواں دواں رہتا ہے اور لمحہ بھر میں لاکھوں میل کی مسافتیں طے کر لیتا ہے،

عشق کی اک جست نے طے کر دئے قصے تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

وہ مقامات جو ریاضت شاقہ سے بھی طے نہ ہو پائیں وہ منزلیں شیخ کامل کی نگاہ عشق سے آن واحد میں طے ہو جاتی ہیں۔حافظ شیرازی نے اس عنوان کو اپنے ایک شعر میں

اس طرح بیان کیا ہے۔

منزلے عشق بسے دور دراز است ولے
طے شد جادہ صدسالہ بآہے گاہے

عشق کی منزل تو بہت دور ہے مگر کبھی کبھی سو سال کے راستے ایک درد بھری آہ سے بھی طے ہو جاتے ہیں۔

اسی عنوان کو دوسرے شعر میں اس طرح بیان کیا ہے

کعبۂ مقصود گر باشد ہزاراں سالہ راہ
نیم گامے ہم نہ باشد شوق چوں رہبر شود

فرماتے ہیں تمنا کا کعبہ ہزاروں سال کی راہ پر بھی ہو گا مگر عشق راہنمائی کرے تو یہ سفر آدھا قدم بھی نہیں ہوتا۔

یاد رہے محبت کے مدارج محبوب کے مدارج پر منحصر ہیں جس قدر محبوب ارفع ہو گا محبت کا درجہ اسی قدر ارفع ہو گا، محبت کو ذات وصفاتِ محبوب سے جس قدر عرفان ہو گا اسی قدر زیادہ استحکام ہو گا۔ عشق کے عنوان پر صوفی غلام رسول صاحب کا لکھا ہوا ایک شعر وزنی محسوس ہوتا ہے

عشق کرم دا ازلی قطرہ تیں میں دے وس ناہیں
اکناں لبھیاں ہتھ نہ آوے اکناں دے وچ راہیں

مولانا جامی اس عنوان عشق کو بیان کرتے ہیں:

جامی رہ ہدیٰ بخدا غیر عشق نیست
گفتم السلام علی من اتبع الہدیٰ

عشق ومحبت

مولانا رومی نے اپنی اس کتاب میں عشق ومحبت کا اکثر و بیشتر ذکر کیا ہے۔ یہ یاد رہے محبت کے کئی مراحل ہیں، اللہ کی راہ میں ایثار محبت کا جذبہ ہے یہ بھی ایک مرحلہ ہے دنیا کے معاملات سے نکل کر آخرت کی سوچ وفکر میں رہے یہ بھی ایک مرحلہ ہے۔ یہ بھی ایک مرحلہ ہے کہ اپنے دل کو خیالات فاسدہ سے پاک کرے۔ محبت کا یہ بھی ایک مرحلہ ہے کہ محبوب کے گرد رہنا اور اس ذوق وجنون سے پروانے کو شکست دے دینا، محبت کا یہ بھی ایک مرحلہ ہے کہ حسن محبوب کا جواب نہ پانا۔ محبت کا آخری درجہ محبوب سے ملاقات ہے اور اس کے حسن میں فنا ہونا ہے، عشق ومحبت کی مثال پروانے کے سفر کی ہے، پروانہ شمع کی روشنی کو دیکھ کر گھومنے لگتا ہے اس کا سفر محبت مکمل اس وقت ہوتا ہے جب اپنے کو جلا کر آگ میں فنا کر دیتا ہے۔

اہل اللہ کے عشق ومحبت کا بھی ایسا ہی انجام ہے یہ لوگ بھی اپنے کو محبوب کی ذات میں مٹا کر ہی سکون پاتے ہیں عشاق کی اپنے رب قدوس سے وابستگی محبت کا ایک مقام ہے، عاشق کا اپنے رب قدوس سے محبت کا ایک واقعہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے دور کا بڑا مشہور ہے، جناب کلیم علیہ السلام کا گذر ایک گڈریے، چرواہے پر ہوا وہ اپنے رب سے اس طرح محو گفتگو تھا، میرے اللہ! اگر تو میرے پاس ہوتا تو تجھے کھانا کھلاتا، شربت پلاتا، تجھے نہلاتا، میل اُتارتا، سر کی جوئیں نکالتا، موسیٰ علیہ السلام اس کی یہ باتیں سن کر پریشان ہوئے مگر یہ ساری گفتگو شان ربوبیت کے خلاف تھی موسیٰ علیہ السلام نے اُسے ڈانٹ دیا، گڈریا رونے لگا موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی، موسیٰ!

تو نے میرے ایک دوست کو پریشان کر دیا تجھے بھیجا تو تھا کہ لوگوں کو مجھ سے ملائے تو نے ملے ہوئے کو بھی الگ کر دیا ہے، جا اُسے راضی کر۔

مولانا رومی نے اپنی کتاب کا آغاز آہ وزاری، تڑپ اور بے چینی کے عنوان سے کیا ہے۔

عظیم نعمت

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بے شمار نعمتیں ہیں مگر عشق و محبت کی نعمت عظیم ترین نعمت ہے جو کسی خوش نصیب کو ملتی ہے، اس عظیم نعمت کو چار چاند لگانے والی شے درد، تڑپ اور بے چینی ہے۔ عشق و محبت کی یہ نعمت فرشتوں کو بھی ملی تو ہے مگر وہ درد سے محروم ہیں، وہ کیفیت جو عاشق ذوق و درد، آرزو لئے وصال سے محسوس کرتا ہے وہ انسان کا ہی حصہ ہے، فرشتے محروم ہیں، اہل دل کو یہ مقام نصیب ہوتا ہے مگر کئی ایک مشکلات و مصائب سے گزرنا پڑتا ہے۔

عشق را صد ناز وار ستکباریست
عشق با صبر ناز ے آید بدست

اس عظیم نعمت کے بڑے ناز و نخرے ہیں یہ نعمت بڑی مشکل سے ہاتھ آتی ہے یہ عظیم نعمت شروع سے ہی مشکل نظر آتی ہے، ہیبت والی محسوس ہوتی ہے تا کہ کوئی ایسا ویسا نا اہل شخص اس کے دربار گوہر بار میں حاضر ہی نہ ہو سکے۔

یاد رکھیں یہ ساری باتیں عشق حقیقی کے بارہ میں ہی کہی جا رہی ہیں، یہ ایسی جنس نہیں ہے جسے بازار سے خریدا جا سکے یہی وہ نعمت ہے جو زندگی کی تلخی کو میٹھا بنا دیتی

ہے، قید خانے کو چمن بنا دیتی ہے، کانٹوں کو پھولوں میں بدل دیتی ہے، تلخیاں مٹھاس اختیار کر لیتی ہیں، یہی عظیم نعمت ہے جو موت کو حیات میں بدل دیتی ہے، اس نعمت کا عروج وکمال یہ ہے کہ درد کی چاشنی ہو، درویش کے دل میں جو اچانک ذوق و مستی پیدا ہوتی ہے وہ کیفیت جلوۂ محبوب سے ہی پیدا ہوتی ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نعمت کی چاشنی جو تھوڑی سی میرے اندر پیدا ہوئی ہے وہ میرے شیخ و مرشد حضور خواجہ میاں علی محمد خاں علیہ الرحمہ کی توجہ سے ہوئی۔

ایک موقعہ پر ملتان ریڈیو والوں نے مجھے رومی کے عشق ومحبت پر تبصرہ کیلئے دعوت دی میں نے اپنے شیخ کے حضور حاضر ہو کر اس مسئلہ پر مدد چاہی تو آپ نے جھٹ مولانا رومی کا یہ شعر پڑھا۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون جالینوس ما

اے عشق خوش رہے تو ہی ہماری ساری بیماریوں کا علاج ہے تو ہی ہمارے نخوت و ناموس کی درد ہے تو ہی ہمارا افلاطون ہے تو ہی ہمارا جالینوس ہے۔

یہ باتیں جو میں عرض کر رہا ہوں اُسی ایک حسین محفل کا ہی خلاصہ ہیں، مولانا کے عشق و محبت کے اس عنوان کو ان کے مرید خاص ڈاکٹر اقبال اس طرح لکھتے ہیں۔

اقبال تیرے عشق نے سب بل دیئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

مولانا نے اس عنوان کو ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے

جسم خاک از عشق بر افلاک شد

حضور ﷺ کے آسمانوں پر جانے کا باعث یہی عظیم صفت ہے۔

مثنوی شریف کے پڑھنے والے کے ذہن میں یہ بات رہے کہ مولانا نے جہاں کہیں معشوق کا ذکر کیا ہے اس سے مراد رب قدوس کی ذات والا صفات ہے، دیرپا اور ہمیشہ رہنے والا عشق وہ رب قدوس کا ہی ہے کہ نہ رب قدوس کو فنا ہے اور نہ ہی اس کے عشق کو، حی و قیوم ذات کا عشق بھی دائمی ہوگا۔

عشق و محبت کی ایسی کیفیت ہے جس میں زبان اور قلم بے بس ہو جاتے ہیں اور عاشق پر حالات کسی وسیلے واسطے کے بغیر کھل جاتے ہیں، عاشق کی جنونی باتیں بہت بھلی پیاری لگتی ہیں۔ مولانا نے اپنی اس کتاب مثنوی شریف میں عشق و محبت کے عنوان کو جگہ جگہ بیان کیا ہے مثال کا رخ کیسا بھی ہو عشق واضح ہوگا۔ مولانا نے اس کائنات کے ہونے کا سبب بھی عشق ہی بتایا ہے، فرماتے ہیں عشق ایسی قوت ہے جس سے بڑے بڑے طاقتوروں کو زیر کیا جا سکتا ہے، پھر یہ قوت صرف انسانوں پر ہی نہیں چلتی اس طاقت کے بحر و بر پر حکومت کی جا سکتی ہے۔

اسی عنوان کو کئی اور صوفیوں نے بھی اپنے اپنے رنگ میں بیان کیا ہے، میاں محمد بخش علیہ الرحمہ ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں فرماتے ہیں

جس دے دل وچ عشق نہ رچیا کتے اس تھیں چنگے
مالک دے گھر راکھی کر دے صابر بھکے ننگے

عشق و محبت کی اہمیت کو ایک مقام پر اس طرح فرماتے ہیں کہ جسم کے وجد سے تو خاکی

دنیا میں انقلاب آتا ہے مگر عشق و محبت سے جو روح میں انقلاب آتا ہے اس سے آسمان بھی درہم برہم ہو جاتے ہیں۔روحانیت کے وہ مقامات جہاں زاہد، عابد سالہا سال لگا کر پہنچتے ہیں عشق و محبت کے شراب سے مست بندہ ایک آہ میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ یاد رہے عشق سالوں مہینوں کو نہیں جانتا اور نہ ہی وہ جلدی اور دیر کو پہچانتا ہے نہ راستہ کی دوری اور نزدیکی کو خاطر میں لاتا ہے، عشق کی قوت پہاڑ میں شگاف پیدا کر دیتی ہے۔عشق بغیر بال و پر کے پرواز کر لیتا ہے اور مکان سے لامکاں تک پہنچنے میں اُسے کسی قسم کی رکاوٹ نہیں، عشق شراب حیات ہے جو بندے کو اپنے محبوب حقیقی تک پہنچا دیتا ہے، عاشق کا ہر سانس ہر لمحہ یادِ محبوب سے ہی وابستہ ہوتا ہے وہ مقدس امانت جسے زمین و آسمانوں پر رکھا گیا اور انہوں نے اس بوجھ اٹھانے سے معذرت کر دی وہ عشق و محبت کی امانت ہی تھی جسے بخوشی انسان نے قبول کر لیا، زمین و آسمان اور پہاڑوں نے اس بوجھ اٹھانے سے معذرت اس لئے کی کہ انہوں نے اس بوجھ کو دیکھا اس کے اٹھانے میں اپنی کمزوری محسوس کی ،حضرت انسان نے اس بوجھ کو نہ دیکھا بلکہ بوجھ ڈالنے والے کو دیکھا تو جھٹ ہاں کر دی کہ جو بوجھ ڈال رہا ہے اُٹھانے کی طاقت بھی دے دے گا۔

حضرت مولانا نے اپنی اس کتاب مثنوی شریف میں عشق و محبت کے پودے کو پروان چڑھانے کیلئے کئی واقعات، تمثیلات بیان کی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح عشق و محبت کی بیل پروان چڑھ جائے۔فرماتے ہیں عشق و محبت کی بیماری تمام بیماریوں سے مختلف ہے، فرماتے ہیں عشق و محبت کے درخت ہر حال میں ہر موسم میں خزاں ہو یا بہار تر و تازہ رہتے ہیں۔

مولانا کا نظریہ ہے کہ عشق و محبت کے معاملہ کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء، چونکہ محبوب حقیقی رب قدوس جل مجدہ کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء ہے اس سطرح ہی اس کے عشق و محبت کا مسئلہ ہے۔

مولانا کا نظریہ ہے کہ عشق و محبت کا دریا ایسا گہرا ہے کہ اس کی گہرائی کا پتہ ہی نہیں، عشق و محبت کے درخت کے سرسبز رکھنے اور اُسے ہر بھرا دیکھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس پودے کو یادِ خدا اور آہ وزاری کا پانی ملتا رہے، تڑپ و وجد کی کیفیت سے دل کا زنگ دُھلتا رہے، عشق و محبت کی کیفیت ایک ایسا مضبوط قلعہ ہے، جس کو دنیا کی کوئی طاقت سر نہیں کر سکتی۔ ایسے واقعات ملتے ہیں کسی صحابی عاشق رسول پر کسی خونخوار جانور نے حملہ کرنا چاہا تو انہوں نے کہہ دیا خبردار! یہ جسم حضور ﷺ پر فدا ہو چکا ہے تو وہ جانور حملہ کرنے سے رک گیا۔

مولانا نے اس عشق و محبت کی کیفیت کو اس طرح ذکر کیا ہے فرماتے ہیں دنیا کا ہر ذرہ عشق و محبت سے ہی قائم ہے، رب قدوس جل مجدہٗ کا عشق و محبت کمال عظمت کا آفتاب ہے اور یہ ساری کائنات اس کے سایہ کی طرح ہے، مولانا عشق و محبت کا شکار ہو جانے کو روحانیت کا بلند ترین مقام قرار دیتے ہیں اور وہ دل جو عشق و محبت سے آشنا نہیں اُسے سیاہ ترین تباہ کن اور برباد گھر بتاتے ہیں کہ اس میں محبوب جلوہ گر نہین اور کسی دل میں جلوۂ محبوب کا ہونا اس دل کی حفاظت ہے۔ کسی قسم کا رنج وغم وہاں بھٹک ہی نہیں سکتا۔

عشق و محبت صفات خداوندی میں سے ایک عظیم صفت ہے جس کا اشارہ اس حدیث سے ملتا ہے ''میں چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو مخلوق کو

پیدا کر دیا، مخلوق کا پیدا کرنا محبت ہی کا جلوہ ہے، جب کبھی کسی مقام پر عقل اور عشق کا اکٹھ ہو تو عقل بری طرح مار کھا جاتی ہے اور عشق نمبر لے جاتا ہے۔ اقبال مرحوم نے اس عنوان کو شاندار شعر میں سمویا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

مولانا کا مؤقف یہ ہے کہ عشق و محبت میں فنا ہو جانا ہی اصل زندگی ہے، یہی دائمی حیات ہے یہی ابدی سکون ہے زندگی کی تمام خوشیاں اسی کے تحت ہیں، عشق ایک بحر بے کنار ہے اور آسمان اس پر جھاگ ہے، عشاق الٰہی کے دل ہمیشہ اس کی یاد سے معمور رہتے ہیں وہ عشاق یاد الٰہی سے غافل ہونے پر اُن غافل لمحات کو دائرہ ارتداد میں شمار کرتے ہیں، ان دلوں کو یاد الٰہی سے ہی اطمینان ملتا ہے ان دلوں کو غیر اللہ کی خبر ہی نہیں ہوتی، ہمیشہ ہر لمحہ ہر لحظہ قرب الٰہی میں ہی رہتے ہیں، جو بندہ عشق و محبت کی دولت سے نوازا جاتا ہے وہ اپنے محبوب خدائے قدوس کے سوا ہر شے سے نابینا ہے۔ اس کی بینائی صرف ذات خدا تک ہی محدود ہوتی ہے۔

اہل دل عشاق کو جو دکھ، درد، رنج پہنچتا ہے اس سے وہ پریشان نہیں ہوتے اُسے شاندار میٹھا پھل سمجھ کر وقت گزار لیتے ہیں جبکہ دنیادار کیلئے وہ رنج وغم مصیبت ہی مصیبت ہے۔ عشق و محبت کے عنوان پر مولانا کا نظریہ بہت وسیع ہے فرماتے ہیں:
عشق کائنات کے ذرہ ذرہ میں جاری ہے، انسان ہو یا کوئی حیوان پتھر ہو یا درخت، ریت کا ٹیلا ہو یا پہاڑ کی چٹان، عشق ان میں بھی کسی نہ کسی رنگ میں مسلط ہے، اس کی اہمیت کو ایک مقام پر اس طرح بھی فرماتے ہیں۔

چوں قلم اندر نوشن می شقافت
چوں بعشق آمد قلم بر خود شگافت

جب قلم عشق کے عنوان کو لکھنے لگا تو اس کا سینہ چِر گیا، عشق کے ضمن میں مولانا فرماتے ہیں ہماری انسانی عقل کو عشق کے مقام تک ہمتِ پرواز قطعی نہیں، مقام عشق تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کے پَر ٹوٹ جاتے ہیں، فرماتے ہیں عشق کے پاس اپنی ایک عقل ہے جو ہماری عقول پر لاکھوں مقامات، لاکھوں مدارج کی حقیقتوں کو کھول کھول کر روشن کر سکتی ہے، عام انسانی عقل ظاہری دنیا تک محدود ہے مگر عشق و محبت کی عقل سے پوری کائنات روشن ہو جاتی ہے، پھر اس کی قوت و ہمت سے عاشق کائنات بھر کے ہر حصہ میں پرواز کر لیتا ہے اور کوئی شے اس کی گرفت سے باہر نہیں ہوتی، مولانا نے ایک مقام پر اپنے لئے اس کیفیت کا اظہار اس طرح کیا ہے

اے خدا جاں را تو ہما آن مقام
کاندار وے بے حرف مے روید کلام

اے پیارے رب قدوس اس بندے کو بھی وہ مقام عطا کر جس میں الفاظ و کلمات اور حروف کے بغیر کلام بن جاتا ہے۔

عشق و محبت والے کے بارہ میں حضرت مولانا کا نظریہ ہے کہ اگر عاشق کو دنیا بھر کے خزانے بھی دے دیئے جائیں تو وہ خزانوں کو ٹھکرا دے گا اور عشق و محبت کو سینے سے لگائے رکھے گا، عاشق جنت کے شوق میں اور جہنم کے ڈر میں عبادت نہیں کرتا وہ تو صرف اپنے محبوب رب قدوس جل مجدہٗ کی رضا کیلئے سربسجود ہوتا ہے۔ خزانوں کو اس لئے ٹھکرا دیتا ہے کہ اس کے نزدیک عشق و محبت سے بڑھ کر کوئی دولت ہے ہی نہیں۔

انعامات خداوندی سے یہ بہت بڑاانعام ہے جس سے انسان کونوازا جاتا ہے، وہ رب قدوس جس نے آسمان کو چاند تارے سورج سے حُسن دیا، زمین کو پھلوں، پھولوں اور باغات سے مزین کیا وہی رب قدوس اپنے کسی بندے کوعشق ومحبت کے حسن سے نوازدے تو یہ اس کا کرم ہے فضل ہے جسے چاہے عطافرمادے۔

مولانا کا عقیدہ ہے کہ اس عظیم نعمت والا بندہ سب بندوں سے افضل واعلیٰ اورممتاز ہوتا ہے،فرماتے ہیں

ملت عشق از ہمہ ملت جداست

عشق ومحبت کا دین تمام نظریات سے الگ ہے،فرماتے ہیں دین کی حقیقت ایمان کی جلوہ گری اسلام کی روح اسی دل میں کامل موجزن ہوتی ہے جس دل میں عشق ومحبت کی جلوہ گری ہوعشق ومحبت والے کے منہ سے جہالت کی بات نکلے تو وہ بھی عقل وفکر کی بات بن جاتی ہے اس نعمت کے محروم سے عقل کی بات بھی جہالت ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں عشق ومحبت والا خاک کو ہاتھ ڈالے تو وہ بھی سونا دکھائی دیتی ہے، ناقص اورعشق ومحبت سے محروم بندہ سونا بھی پکڑ لے تو خاک دکھائی دیتا ہے اسی مضمون کواس شعر میں فرماتے ہیں۔

کاملے گرخاک گیرد زر شود
ناقص گرزر بردخاکستر شود

حضرت مولانا رومی اس کتاب مثنوی شریف میں اولیاء کی محبت ان سے وابستگی اُن کی رہنمائی کےعنوان کومتعدد مقامات پرنہایت حسین انداز میں بیان کیا ہے کہ اس کتاب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ استفادہ کرسکیں اور بھولے بھٹکے لوگوں کو

بری راہوں سے بچا سکیں ،اولیاء اللہ سے وابستگی کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، وہ ولی کسی خاندان سے کسی نسل سے کسی ملک سے ہو ایسے لوگ بندے کو خدا سے ملا دیتے ہیں، فرماتے ہیں۔

دستگیر و بندۂ خاص اِلٰہ
طالبان را می برد تا پیش گاہ

اولیاء اللہ بندے کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور بارگاہ خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔
حضرت مولانا کے نظریہ میں اولیاء اللہ کا سایہ تمام عالم کیلئے پناہ ہے اور حمایت ہے، اہل اللہ کی عظمت کو ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جو تلوار تجھے چاہئے وہ اللہ والوں کے اسلحہ خانہ میں موجود ہے، اللہ والوں کی زیارت تیرے حق میں کیمیا ہے۔ مولانا جہاں کہیں اللہ والوں کا ذکر کرتے ہیں اس سے مراد وہی لوگ ہوتے ہیں جو عشق و محبت کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، حضرت مولانا نے اپنی اس کتاب مثنوی شریف کا آغاز ہی بانسری کی تڑپ آہ وفغان اور درد کی چیخ و پکار سے کیا ہے، آپ نے بانسری سے مراد انسانی روح کی آہ و پکار لی ہے۔

اقبال مرحوم کی پیر رومی سے جو وابستگی پائی وہ صرف اور صرف عشق الٰہی کی نسبت سے ہے وہ فرماتے ہیں

پیر رومی مرشد روشن ضمیر
کاروان عشق و مستی را راہبر
پیر رومی را رفیق راہ سازی
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

ایک مقام پر علامہ اقبال نے عشق کی اہمیت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں عشق

عقل، دل، نگاہ کا پہلا کامل اکمل مرشد عشق ہی ہے، عشاق کے بارہ میں سلطان باہو کا یہ شعر بڑا وزنی ہے،

عاشق پڑھن نماز پرم دی میں وچ حرف نہ کوئی ہو
جیبھ نہ ہلے ہونٹ نہ پھڑکن اصل نماز ہے سوئی ہو

مجھے افسوس ہے میں اپنی بیماری کمزوری اور مصروفیتوں کے سبب پوری مثنوی شریف کا مطالعہ نہ کر سکا۔ چیدہ چیدہ مقامات سے فائدہ اٹھایا، یہ بات بھی ذہن میں رہی کہ مثنوی شریف کے بارہ میں بہت سے لکھے پڑھے علماء، صوفیاء اور اہل اللہ نے دل کھول کر لکھا ہے۔ میں ان سے زیادہ کیا لکھ سکوں گا اللہ کرے یہ مختصر سی تحریر حضرت مولانا کی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازی جائے۔

تصوف

حضرت مولانا روم علیہ الرحمہ کی یہ ساری کتاب درس تصوف دیتی ہے، بریں بناء اس پر چند حروف تحریر ہیں۔

لفظ ''تصوف'' سے بعض لوگ پریشان ہو جاتے ہیں کہ یہ علم تصوف تو نماز روزہ کی بات بتاتا ہے اور اسے اَنہونی کہہ کر نظر انداز کر دیتا ہے مجھے یاد آتا ہے ساہیوال کے چند نوجوانوں نے تصوف کانفرنس منعقد کی تھی اور مجھے اس میں خطاب کی دعوت دی تھی۔

''تصوف'' اصلاح نفس، تزکیہ وتطہیر قلب اور مشاہدہ کا نام ہے۔شیخ ابوالحسن نووی تصوف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: تصوف کسی رسمی شے کا نام نہیں وہ تو اخلاق حسنہ کا نام ہے۔ایک دوسرے مقام پر یہی بزرگ تصوف کے بارہ میں اس طرح فرماتے ہیں''التصوف الحریۃ الکرم و ترك التکلف والسخاء ''فرماتے ہیں تصوف آزادی بخشش بے تکلفی اور سخاوت کا دوسرا نام ہے۔

حرص ولالچ سے آزادی نفس وشیطان سے آزادی کا دوسرا نام تصوف ہے۔

حضرت شیخ ابوبکر الکتانی تصوف کے عنوان پر بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں تصوف اخلاق حسنہ کا نام ہے جو شخص خلق میں تم سے زیادہ ہے وہ صفات میں بھی زیادہ ہے۔

ابومحمد الحریری اس عنوان کو اس طرح بیان کرتے ہیں: ہر اچھے خلق کا اپنانا اور ہر بری بات سے الگ تھلگ رہنا تصوف ہے۔اسی عنوان پر علی بن نیدار الصیر نی فرماتے ہیں '' التصوف اسقاط الرویۃ للحق ظاھرا و باطنا ''تصوف یہ ہے کہ صاحب تصوف اپنے آپ کو کسی حال میں نہ دیکھے اور دیکھے تو کلیۃ ذات والا صفات کو دیکھے۔

تصوف کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ عمل کے اندر اخلاص ہو، عبادت و ریاضت، ریا سے پاک ہوں، عمل صالح صرف رضاء الٰہی کیلئے ہی ہو جیسے حضرت رابعہ بصری کی بات ملتی ہے بارگاہ قدس میں عرض کرتی ہیں، اے میرے اللہ! اگر میں نے عبادت جہنم کے خوف سے کی ہے تو مجھے دوزخ میں ڈال دے اور اگر حصول جنت کیلئے کی ہے تو مجھے جنت سے محروم کردے اور اگر میری عبادت تیری رضا کیلئے ہے تو مجھے اپنی زیارت سے محروم نہ کرنا۔

امام محمد غزالی علیہ الرحمہ اپنی کتاب احیاء العلوم میں اس عنوان پر اس طرح

تبصرہ کرتے ہیں، اس (تصوف) کا راستہ یہ ہے کہ پہلے مجاہدہ کر کے اپنے کو بری عادات سے پاک کرلے، تمام تعلقات سے ہٹ کر رب قدوس سے تعلق قائم کرلے جب یہ درجہ نصیب ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ اس بندے کے دل کا متولّی بن جاتا ہے۔ حضرت ممشاد علی دینوری فرماتے ہیں: بے کار چیزوں کو ترک کر دینا تصوف ہے۔ حضرت سہیل بن عبداللہ تستری فرماتے ہیں کم کھانا، خلق سے دور رہنا اور خالق کی عبادت کرنا تصوف ہے۔ حضرت سلیمان دارمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: تمام تکالیف کو اللہ کی طرف سے سمجھ کر صبر کرنا اور ماسوی اللہ کو ترک کر دینا تصوف ہے۔ حضرت معروف کرخی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں اللہ پر بھروسہ کرنا اور مخلوق سے نا اُمید ہونا تصوف ہے۔ حضرت ابوبکر شبلی فرماتے ہیں بارگاہ قدس میں بے غم زندگی گزارنا تصوف ہے۔ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ماسوی اللہ کو ترک کر دینا اور خود فنا ہو جانا تصوف ہے۔ محمد بن احمد فقری فرماتے ہیں تصوف ذات حق کے ساتھ استقامت کا نام ہے۔ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں تصوف کے متعلق فرماتے ہیں: تصوف کا معنی عبادت پر استقامت ہے ہر معاملہ میں اپنے رب حیّ و قیوم کی طرف توجہ دینا ہے اور دنیا کی زیب و زینت سے روگردانی کرنا ہے۔

غلط فہمی

کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ تصوف اسلام سے الگ کسی شے کا نام ہے (معاذ اللہ) یاد رہے تصوف اسلام ہے اور اسلام کا حسن و جمال ہے، اسلام کی خوبی ہے اسلام کی زینت ہے، تصوف "الا للّٰہ الدین الخالص" کی خالص تصدیق

ہے،تصوف ’’قد افلح من زکھا ‘‘ کی واضح تفسیر ہے۔تصوف ’’واما من خاف مقام ربہ ونہی النفس عن الھویٰ ‘‘ کا واضح بیان ہے۔’’فان الجنۃ ھی الماویٰ ‘‘ کا پیش خیمہ ہے۔’’ولمن خاف مقام ربہ جنتان ‘‘ کی توضیح ہے۔تصوف ’’ان صلوٰتی و نسکی و محیای ‘‘ کی تعبیر ہے،تصوف ’’لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ‘‘ کے قلعہ میں آنا ہے،تصوف ’’بلی من اسلم وجہہ لِلّٰہ ‘‘ کا حسین آئینہ ہے،تصوف ’’والذین جاہدوافینالنہدیہنہم سبلنا ‘‘ کا کھلا درس ہے، وہ لوگ جنہوں نے ہم تک پہنچنے کی کوشش کی ہم انہیں اپنی راہیں دکھاتے ہیں، یہ بات یاد رہے کہ دین سے نفرت،شریعت سے دوری کی ہر شے تصوف سے دور ہے۔دین کے باغی شریعت سے دور،تصوف سے قطعی نا آشنا ہیں۔

خلاف پیغمبر کسے راہ گزید

کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

حضور ﷺ کی راہ سے ہٹ کر کوئی شخص منزل مقصود کو نہیں پہنچ سکتا،تصوف کو شریعت مطہرہ سے وہی تعلق ہے جو جان کو جسم سے ہے آج کے اس تاریک دور میں صوفیاء کے مشن کو اپنانا ان کی راہ پر چلنا ہی کامیابی ہے۔

حقیر سمجھ کر جنہیں بجھا دیا تم نے

وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

صوفی

سب سے پہلے جس شخص پر لفظ ''صوفی'' استعمال ہوا ہے اور انہیں یہ لقب دیا گیا وہ ابوالہاشم تھے جو ۱۵۰ھ میں فوت ہوئے ،بعض نے کہا ''صوفی'' کو صوفی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنے زہد وتقویٰ اور پرہیز گاری کے باعث اللہ کے فضل سے صف اول میں ہوگا۔بعض نے کہا صوفی اصحاب صفہ سے پیار رکھتا ہے جو بندہ اپنے ظاہر و باطن کو اسلام اور شریعت کے مطابق استعمال کرے اور اس کا دل نور شریعت سے منور ہو جائے وہ ''صوفی'' کہلاتا ہے۔

بعض نے کہا صوفی کا لفظ یونانی زبان کا لفظ ہے،جس کا معنی حکمت ، دانائی کا آتا ہے، جب اس لفظ کو عربی میں ڈھالا گیا تو صوفی ہوا کہ وہ بھی حکمت ، دانائی ، اخلاق حسنہ،اخلاص اور دیانت وشرافت کے اصولوں سے محبت رکھتا ہے۔

بشر حافی فرماتے ہیں

صاف شو با حق نہان در شکار
صوفیان صاف را ایں است کار

اللہ کا ساتھ اس کا ظاہر و باطن صاف ہو،یہی صوفیوں کا کام ہوتا ہے حضرت حضرمی ''صوفی'' کے بارہ میں فرماتے ہیں ''الصوفی لا یوجد بعد عدمہ ولا یعدم بعد وجودہ ''صوفی وہ ہے کہ اس کی ہستی کو نیست نہ ہو اور اس کی نیست کو ہستی نہ ہو۔ جس شے کو وہ پالے گم نہ ہو اور جس کو وہ گم کر دے اُسے وجود نہ ہو۔

حضرت شبلی صوفی کے متعلق فرماتے ہیں '' لا یریٰ فی الارض غیر اللّٰہ ''جو

اللہ کی ذات کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتا وہ صوفی ہے ۔حضرت ابوالحسن فرماتے ہیں ’’الصوفی الذی لا یملك ولا یُملك ‘‘صوفی وہ ہے جو نہ کسی کا مالک ہو اور نہ کسی کا مِلک ہو، یعنی وہ کسی کی قید میں نہ ہو اور نہ کچھ اس کی قید میں ہو۔ بعض جاہلوں نے کہا تصوف کی تعلیم گوتم بدھ سے ماخوذ ہے یہ بہت بڑا جھوٹ ہے، گوتم بدھ تو وجود خداوندی کا ہی قائل نہ تھا، تو خدا تک پہنچے کا راستہ بتانے کا کیا معنی؟ صوفی کی عظمت کا اندازہ کرنے کیلئے برصغیر کے نامور صوفی خواجہ معین الدین اجمیری علیہ الرحمہ کے کارناموں کو دیکھا جائے، جن کی للکار حق نے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا تھا اور اسلام کی دولت سے لاکھوں افراد سرفراز ہوئے ۔صوفی کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب چنگیزی طوفان اُٹھا جس نے ہزاروں شہروں کو برباد کیا، بغداد کو تباہ کرنے والے کے منصوبہ کی یلغار کا مقابلہ کیا، طوفان کا رُخ موڑا، یہ صوفیاء کے گروہ کا ایک فرد تھا جس نے یکسر ساری بدامنی کو امن میں بدل دیا۔ ہلاکو خاں کا چچازاد بھائی برکہ نامی شمس الدین کے ہاتھوں مسلمان ہوا یہ صوفیاء کی جماعت ہی تھی کہ اسلام دشمنوں کے مقابلہ سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑی ہوتی رہی اور اسلام کو سرفرازی ملتی رہی

فلسفۂ عشق

حضرت مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب مثنوی شریف میں عشق کے موضوع پر بڑا تبصرہ کیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے اس پر بھی کچھ تبصرہ ہو جائے ، پیر رومی علیہ الرحمہ نے عشق سے مراد عشق الٰہی لیا ہے کہ یہی شے دولت لا زوال ہے اور شرف باکمال ہے دنیوی تعلقات کا نشہ معمولی مشکل آنے پر اُتر جاتا ہے

مگر عشق الٰہی کا خمار مشکلات میں زیادہ نکھر کر ظہور پذیر ہوتا ہے وہ محبت ولگن جسے مولانا رومی نے مثنوی شریف میں ذکر کیا اس کے بھی کئی مراحل ہیں پہلا مرحلہ یہ ہے کہ خود کو دیکھ کر شیفتگی پیدا ہو جائے۔

دوسرا مرحلہ یہ کہ کسی کی ذات وصفات میں محو ہو جانا ہے، اسی مرحلہ کو محبت کا نام اور عشق کامل کے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی مقام پر محبّ صادق کو ایک دور نصیب ہوتا ہے جس میں اُسے راحت وسکون ملتا ہے۔

شائد اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

یہی محبت انسانی کمالات میں ایک عظیم صفت ہے، اقبال مرحوم نے اس عنوان محبت کو اس طرح بیان کیا ہے،

''عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن''

محبوب کا غلام ہو کر دنیا کو حیران کر دینا عشق ہے۔

اسی عشق ومحبت کو دوسرے مقام پر اس طرح بیان کیا ہے

عشق دم جبریل عشق مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول خدا کا کلام

محبت انسانی کے اندر ایک نورانی صفت ہے جو جسم انسانی میں آنے سے پہلے بھی روح کے اندر پائی جاتی تھی جس کی طرف مولانا رومی نے اس شعر میں اشارہ فرمایا ہے

ہر کسے کو دور ماند اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

عشق الٰہی وہ عظیم دولت ہے جو نا اُمیدی کو ٹھوکر مارتی ہے اور زندگی کو کامیابی سے نوازتی ہے۔

اقبال نے اچھا کہا

عشق کی گرمی سے معرکہ کائنات
علم مقام صفات عشق تماشاء ذات

مولانا رومی نے فلسفہ عشق کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عشق کی دولت سے نوازا جانے والا حرص وہوا سے پاک ہو جاتا ہے۔اس عنوان کو مولانا نے اپنے اس شعر میں بیان فرمایا ہے

ہر کہ را جامہ ز عشق چاک شد
اور ز حرص وعیب کلی پاک شد

جس شخص کا جامہ عشق سے چاک ہو گیا وہ تمام قسم کی حرص وعیب سے پاک ہو گیا۔

فرماتے ہیں

جسم خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد چالاک شد

یہ خاکی جسم عشق کی وجہ سے ہی آسمانوں کو لے کر گیا، یہ عشق ہی ہے جس کی وجہ سے پہاڑ وجد میں آ گیا۔

عشق کی دولت سے تعلقات ماسوی اللہ سے نجات مل جاتی ہے اور حرص و آرزو کا زوال ہو جاتا ہے، بندہ اخلاق ذمیمہ حسد، غصہ، کینہ، عناد بغض ایسی قبیح عادات سے پاک ہو جاتا ہے۔ جذب و کیف بھی ایک ایسی راہ ہے جو بندے کو والہانہ حد تک آگے لے جاتی ہے اور ''یومنون بالغیب'' کے مقام پر فائز کر دیتی ہے، اس جذب و کیف کی ایک حالت یہ بھی ہے کہ بندہ اس منزل کو پانے کے بعد قید و بند کی جہات کی پابندیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

کمال زندگی دیدار ذات است
طریقش استن از بند جہات است

روحانیت کا بلند ترین مقام فنا فی اللہ ہے، وہ یہ ہے کہ اپنی ذات وصفات کو مٹا دے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہئے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

اسی عشق و محبت کو ہی مولانا تمام بیماریوں اور نقائص کا علاج بتاتے ہیں، فرماتے ہیں

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے عشق تو بہت مبارک ہے کہ ہماری ساری بیماریوں کا علاج ہے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اس عنوان کو اس طرح بیان کیا ہے

بذل مال وجاہ وترک نام وننگ
در طریق عشق اول منزل است

فرماتے ہیں سالہا سال کی کوششوں سے راہ پانا عشق کی پہلی منزل ہے،

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشا لب بام ابھی

علامہ اقبال نے بھی اپنے پیر رومی کی اتباع میں عشق کو بہت بڑا مقام دیا ہے۔

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

منزل عشق کو کسی اور نے اچھے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

نقدے کہ داشتیم بہ یغمار برد عشق
دز سورد زیاں و زیابازار فارغہم

ہمارے پاس جو کچھ بھی نقدی تھی سب عشق نے لوٹ لی، ہم نفع نقصان اور بازار سے فارغ ہیں۔

نظریہ وحدت الوجود

حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ مسئلہ وحدت الوجود کے قائل ہیں اور اپنی کتاب مثنوی شریف میں اس مسئلہ پر کوئی نہ کوئی بات، تبصرہ کر دیتے ہیں، بریں بنا مناسب سمجھا کہ اس اہم موضوع پر چند حروف لکھ دئے جائیں یہ مسئلہ بڑا اختلافی ہے اس مسئلہ پر صدیوں سے اہل ظواہر اور صوفیاء میں اختلاف آ رہا ہے۔

۵۰۰ ہجری کے بعد اس سلسلہ میں دو گروہ نمایاں طور پر ایک دوسرے کے سامنے آئے ہیں، پہلا گروہ وحدت الوجود کے قائل صوفیاء کا ہے دوسرا گروہ وحدت الشہود کے قائل صوفیاء کا ہے۔ پہلے طبقہ کا نظریہ ہے کہ وجود مطلق ایک ہی ہے جو

وجوب قدیم، حادث، مومن، کافر، طاہر نجس مختلف مظاہر میں ظاہر ہے لیکن ہر مظہر کا حکم جدا ہے۔ حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ نے اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا ہے کہ تمام موجودات عین معشوق ہیں جو ذات حق ہے اور عاشق جو تعینات و تشخصات میں پایا جاتا ہے محض ایک پردہ۔ اگر یہ پردہ اُٹھ جائے تو عالم نابود ہو جائے اسی طرح معشوق یعنی ذات حق زندہ جاوید ہے اور عاشق مردہ ہے کہ عاشق کا وجود اور اس کی حیات و موت خدا ہی کی ایک شان ہے اگر وہ اس شان کے بغیر جلوہ گر ہونا چاہے تو عالم نیست و نابود ہو جائے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمہ اپنے رسالہ وحدۃ الوجود میں وضاحت فرماتے ہیں کہ وجود سے صوفیوں کی مراد معنی مصدری ہر گز نہیں حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ نے اس مسئلہ پر بہت صاف تقریر فرمائی ہے۔ فتاویٰ عزیزہ جلد اول میں فرماتے ہیں اول یعنی ایں حکم باید فہمید باز حقیقت، حقیقت حال باید شنید معنی وحدۃ الوجود آنست کہ وجود حقیقی بمعنی ما بہ الموجودیت نہ بمعنی مصدری۔ شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی اس تقریر سے واضح ہو رہا ہے کہ شاہ صاحب علیہ الرحمہ اور قاضی ثناء اللہ علیہ الرحمہ اس مسئلہ پر متفق نظر آتے ہیں، شاہ صاحب علیہ الرحمہ اس مسئلہ کو مثال سے پیش فرماتے ہیں۔ ”مثل شعاع آفتاب کہ ہر پاک و ناپاک مے اُفتد و تو ذات پاک ہست ناپاک نمے شود، ایں مسئلہ فی نفسہ حق است ہیچگو نہ مخالف شرع نیست“ فرماتے ہیں جس طرح شعاعِ آفتاب ہر پاک و ناپاک پر پڑتی ہے اور پلید نہیں ہوتی اسی مسئلہ کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جائے کہ مظاہر کے مختلف ہونے سے ذات پر کوئی اثر نہیں۔

پھر فرماتے ہیں قرآن مجید سے بھی چند مقامات پر اس کا اشارہ ملتا ہے

’’سنریھم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق ‘‘عنقریب ہم ان لوگوں کو بھی نشانیاں اطراف عالم میں دکھائیں گے اور ان کے اپنے درمیان بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن برحق ہے، اس عنوان کو شیخ سعدی علیہ الرحمہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ عارفین کے نزدیک وحدت الوجود کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی شے موجود نہیں، رہا اہل قیاس کا اعتراض کہ کائنات میں تو وجود بے شمار چیزوں کا دکھائی دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اس قدر عظیم الشان اور ہر شے پر چھائی ہوئی ہے کہ اس کے آگے پہاڑ، دریا، زمین و آسمان، جن و انس، ملک و فلک کی ہستی کا نام لینا خلاف ادب ہے لیکن یہ لطیف احساس اہل صورت کی سمجھ سے بالاتر ہے یہ تو خاص اہل معنی کا حصہ ہے۔ عارف رومی کا ارشاد ’’جملہ معشوق است ہمہ اوست‘‘ کے ہم معنی ہے جو گویا وحدۃ الوجود کا دعویٰ ہے اس دعویٰ کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام ممکنات تو صرف موجود ظاہر ہیں اور حقیقت میں کوئی موجود نہیں، موجود حقیقی تو صرف ذات حق تعالیٰ ہی ہے، یہ بات مثال کے طور پر یوں سمجھ آئے گی اگر کوئی حاکم سائل سے کہہ دے کہ یہ اس مقدمہ کی رپورٹ کسی پولیس تھانہ میں درج کراؤ تو سائل کہے جناب آپ ہی تھانہ ہیں، آپ ہی پولیس افسر ہیں تو اس کا معنی یہ نہیں ہوگا کہ ایس پی اور پولیس کانسٹیبل برابر کے ہیں، بلکہ اس سے مراد حاکم کا صاحب اختیار ہونا مراد ہے اسی طرح ہمہ اوست میں ’’ہمہ او‘‘ کا اتحاد مقصود نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہمہ کی ہستی قابل اعتبار نہیں بلکہ صرف ’’او‘‘ کی ہستی قابل شمار ہے۔ ہستی تو باقی موجودات کی بھی ہے مگر ان کی ہستی ہستی کامل کے سامنے محض ایک ظاہری ہستی ہے حقیقی اور کامل نہیں مزید سمجھ اس طرح آئے گی۔ صفت کے دو درجے ہوتے

ہیں ایک کامل دوسرا ناقص اور قاعدہ یہ ہے ناقص کو ہمیشہ کامل کے سامنے کالعدم سمجھا جاتا ہے، ایک حاکم کرسی پر بیٹھا حکم چلا رہا ہے اتنے میں بادشاہ وہاں پہنچ گیا تو حاکم کا نشہ ختم ہو گیا اور رُعب سلطانی نہ رہا کہ بادشاہ خود آ گیا ہے، اب اس حاکم کا منصب ختم نہیں ہوا مگر کالعدم ضرور ہو گا اسی طرح ممکنات گو موجود ہیں مگر موجود حق کے روبرو اس کا وجود ناقص ہے اس کے باوجود معدوم نہیں ہوا مگر معدوم کے برابر ہو کر رہ گیا، وحدۃ الوجود کے دعویٰ کا یہی معنی ہے۔

یہی عنوان شیخ سعدی کے اس شعر سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے فرماتے ہیں۔

یک قطرہ باراں زا بر چکید
خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریا ست من کیستم
گراوسیت حقا کہ من نیستم

بارش کا قطرہ بادل سے دریا میں گرا تو دریا کی وسعت کو دیکھ کر شرمندہ ہوا کہ اس کی موجودگی میں قطرہ کی کیا حیثیت ہے، یقیناً دریا میں میری کوئی حیثیت نہیں حضرت مولانا کا موقف بھی ایسا ہی ہے کہ حضرت حق کو زندہ سمجھو اور ممکن کو مثل مردہ جانو گو مردہ بھی کسی درجہ کا وجود تو رکھتا ہے کہ آخر جسم تو ہے مگر زندہ کے روبرو اس کی ہستی قابل اعتبار نہیں کہ ہستی ناقص ہے اور زندہ کی ہستی کامل ہے، کامل کے سامنے ناقص بالکل مضمحل اور ناچیز محض ہے، اسی مسئلہ کو تحقیقی علم کے لحاظ سے توحید کہتے ہیں۔

وحدۃ الوجود کے قائلین میں بڑے بڑے صلحاء ہیں، شیخ اکبر محی الدین عربی، شیخ صدر الدین قونوی، شیخ عبدالکریم، شیخ عبدالرزاق، شیخ امان پانی پتی شامل ہیں،

حضرت مولانا روم، حضرت شمس تبریزی، شیخ فرید الدین عطار، سید محمد گیسو دراز، سید جعفر مکی، خواجہ عبید اللہ احرار، مولانا جامی، ملا عبد الغفور لاری، خواجہ باقی باللہ کابلی، شیخ عبد الرزاق کاشی، سعید الدین فرغانی، شیخ ابراہیم کراں، سیدنا غوث اعظم جیلانی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، سیدنا فرید الدین مسعود گنج شکر علیہم الرحمہ کے اسماء گرامی سر فہرست ہیں۔

حضرت رومی نے اپنے اس نظریہ وحدۃ الوجود کو ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

ہر کہ روئے یار در دنیا ندید
پس نبیند ہم بعقبیٰ اے مرید

جس نے اس دنیا میں اللہ کا دیدار نہ کیا تو وہ عقبیٰ میں بھی اس کی زیارت سے محروم رہے گا۔ اس مسئلہ وحدۃ الوجود کو خواجہ میر اور نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے

گر معرفت کا چشم بصیرت میں نور ہے
تو جس طرح کو دیکھئے اس کا ظہور ہے

ایک اور شعر اس مؤقف کا موید ہے۔

چوں تنت فانی شود در بحر نور
محو گردی و شوی اندر حضور

مولانا جامی نے اس عنوان کو اس طرح بیان کیا ہے۔

خود ہمو شاہد وہم مشہود
غیر او نیست در جہاں موجود

دیکھنے والی ذات شاہد بھی رہی ہے اور جسے دیکھا جا رہا ہو، مشہود بھی رہی ہے، دنیا میں

اس کے بغیر اور کوئی نہیں۔

حضرت بو علی قلندر نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

ہر چہ بینی در حقیقت جملہ اوست
شمع و گل پروانہ بلبل ہمہ اوست

جو کچھ تو دیکھ رہا ہے حقیقت میں وہی ایک ہی ذات کے جلوے ہیں، شمع وہی خود ہے اور پروانہ بھی وہی آپ ہیں گل بھی وہی ہے اور بلبل بھی اس کی اپنی ذات ہے۔

یہی حضرت بو علی قلندر دوسری جگہ اس طرح فرماتے ہیں۔

اوست در ارض و سما و لامکاں
اوست در ہر ذرہ پیدا و نہاں

ہر ذرہ کے ظاہر و باطن میں اسی کی ذات موجود ہے۔

مولانا رومی اقبال کی نگاہ میں

علامہ اقبال اپنے روحانی شیخ مولانا رومی کو عقیدت کا نذرانہ اس طرح پیش کرتے ہیں

سراپا درد سوز آشنائی
وصال او زباں دان جدائی
جمال عشق گیرد از نئے او
نصیبے از جلال کبریائی

فرماتے ہیں، مولانا رومی کا کلام سارے کا سارا درد ہے سوز ہے محبت ہے اور اس کا وصل ہجر کا ترجمان ہے اس کے نغموں کی بدولت عشق کا جمال کبریائی جلال کی شان

رکھتا ہے۔

ایک اور مقام پر مولانا کی عظمت اور روحانی قوت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

گرہ از کان ایں ناکارہ وا کرد
غبار رہگذر را کیمیا کرد

اس شیخ کامل نے مجھ جیسے ناکارہ کی مصیبتیں دور کردیں اور مجھ غبارِ راہ کو کیمیا بنادیا۔

پیر رومی سے اپنی عقیدت کو ایک اور انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

بگیر از ساغرش آں لالہ رنگے
کہ تاثیرش دہد لعلے بہ سنگے

اس (پیر رومی کے) پیالہ سے سرخ رنگ کی شراب لے جس کی تاثیر پتھر کو بھی لعل بنا دیتی ہے۔

ایک اور مقام پر اس طرح فرمایا

نور قرآن درمیاں سینہ اش
جام جم شرمندہ از آئینہ اش

قرآن مقدس کے نور سے ان کا سینہ بھرپور ہے، جمشید کا جام بھی ان کے آئینہ کے سامنے شرمندہ ہے۔

نصیبے برام از تاب و لب او
شبم ما نند روز از کوکب او

میں نے اس کی روشنی کمال عظمت سے حصہ پایا ہے اسی کے ستارے نے میری رات کو ان کی طرح روشن کردیا ہے۔

ایک اور مقام پر اس طرح کہتے ہیں:

بردے من دردل باز کردند
زخاک من جہانے ساز کردند
زفیض او گرفتم اعتبارے
کہ بامن ماہ و انجم ساز کردند

اُسی شیخ رومی نے مجھ پر دل کے دروازے کھول دیئے، میری خاک سے ایک نیا جہاں تعمیر کیا گیا۔ میں نے اُسی شیخ کے فیض سے وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ اب چاند سورج میری موافقت میں چلتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں میں ایک رات اپنی پریشانی اور بے سروسامانی پر رو رہا تھا کہ شیخ رومی کا چہرہ نمودار ہوا اور مجھ سے کہا

گفت اے دیوانہ ارباب عشق
جرعہ گیر از شراب ناب عشق

اے عشق و محبت کے دیوانے شراب عشق کا ایک گھونٹ تو پی۔

مثنوی شریف

حضرت مولانا روم علیہ الرحمہ کی یہ تصنیف مثنوی کے نام سے مشہور ہے، مثنوی کے ابیات کم از کم دو ہوتے ہیں زیادہ کی حد مقرر نہیں، مولانا کا یہ کلام اصول دین کی گہری باتوں کا مجموعہ ہے۔اسرار الٰہیہ کا خزینہ ہے علم تصوف کی جان ہے دین کے عملی شعبہ کے اصولی مطالب کا لُب لباب ہے یہ کتاب دل کی صفائی اور قوت ایمانی

کیلئے بہترین دولت ہے، مولانا کا یہ کلام علم احکام اور علم تصوف دونوں پر مشتمل ہے اس کتاب سے متعدد مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت اور تصوف دو مختلف اور متضاد چیزیں نہیں بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ الگ الگ دو چیزیں ہیں ایسا ہرگز نہیں، علم تصوف جس کو سلوک، معرفت اور طریقت کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے درحقیقت علم دین پر عمل کرنے کا نام ہے اور اس سے شریعت کی تکمیل ہوتی ہے۔ حضرت مولانا کا یہ کلام مثنوی شریف بتاتا ہے۔ تصوف، شریعت کا وہ بلند ترین رتبہ ہے جس پر خاص خاص لوگ کامیاب ہوتے ہیں ہر کس و ناکس کو اس پر عبور نہیں ہوسکتا۔ حضرت مولانا کی اس کتاب میں معانی و مطالب اس حسین پیرائے سے مزین ہیں کہ غور و فکر سے پڑھا جائے تو واضح محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ایک ایک باب ایک ایک فقرہ روشن چراغ ہے۔ یہ کتاب اپنے حسن افزاء مضامین کے سبب سلوک و عرفان کا مہکتا باغ ہے۔ اس کے پڑھنے سے صوفی کو ایک خاص مقام نصیب ہوجاتا ہے جو عام کتب کے پڑھنے سے میسر نہیں ہوتا۔ خوش نصیب مقدس لوگ اس کتاب سے دلی سکون پاتے ہیں اور تلاش حق کے سلسلہ میں جو انہیں پیاس محسوس ہوتی ہے وہ بجھاتے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ میں دریائے نیل کی سی صورت دکھائی دیتی ہے، فرعونی دریائے نیل میں برباد ہوگئے اور اسرائیلی عافیت سے کنارے لگ گئے، کئی لوگ اِسے پڑھ کر بہک گئے، ڈوب گئے اور کئی عافیت سے کنارے لگ گئے مگر عافیت سے کنارے لگنے والوں کیلئے سیدنا کلیم علیہ السلام کی راہنمائی، محبت کام آئی، ایسے ہی اس کتاب کو عبور کرنے کیلئے حضرت مولانا رومی کے اسرار الٰہیہ کی راہنمائی بھی ضروری ہے، یہ کتاب صوفیوں کے سینوں کیلئے جلاء ہے، شفاء ہے اور انہیں صبر و توکل اور تسلیم و

رضا کی تعلیم دے کر غموں سے نجات دیتی ہے۔

یہ کتاب انعامات الٰہیہ پر شکر کا درس دیتی ہے اور شکر الٰہی ایسی دولت ہے جو رزق میں اضافہ کرتی ہے، بھوک افلاس غربت سے نجات دیتی ہے، یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے مبارک ہاتھ چھوئیں اور گنہگار ہاتھوں سے بچے۔

مولانا رومی کا مختصر تعارف

حضرت مولانا جلال الدین رومی محتاج تعارف تو نہیں کہ آفتاب کا وجود خود بخود ہی اپنی حقیقت وعظمت کا زیور ہے یہاں پر حصول برکت کیلئے چند ایک باتیں عرض کی جاتی ہیں، آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، جلال الدین آپ کا لقب ہے، آپ کا نام محمد ہے، آپ کے دادا حسین بلخی وقت کے عظیم صوفی صاحب دل مقبول عوام وخواص تھے، وقت کے بادشاہ، اُمراء، سلاطین انہیں نہایت قدر ومنزلت سے دیکھتے تھے۔ خراسان کے بادشاہ نے اپنی بیٹی کی ان سے شادی کر دی تھی۔

حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ ۶۰۴ ہجری میں بلخ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد گرامی بہاء الدین محمد اپنے وقت کے عظیم صوفی، زبردست عالم، ممتاز فقیہہ تھے۔ لوگوں کا بے پناہ ہجوم رہتا، ان کی عظمت وشہرت کے فروغ سے حکومت وقت لرز گئی کہ کہیں ہم پر مسلط نہ ہو جائیں۔ حکومت کے غلط نظریات دیکھتے ہوئے آپ نے اپنے بہت سے عقیدتمندوں کے ساتھ وہاں سے ہجرت کی، یہ واقعہ کوئی معمولی نہ تھا آپ جس علاقہ سے گزرتے بے شمار لوگ والہانہ استقبال کرتے، آپ کے والد گرامی

۶۱۰ھ کو نیشا پور پہنچے، اس وقت مولانا روم علیہ الرحمہ کی عمر چھ سات برس کے لگ بھگ تھی، خواجہ فرید الدین عطار آپ کے والد سے ملنے آتے تو حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ کو بچپن میں ہی دیکھتے آپ کے والد سے فرمایا، بہاء الدین یہ عظیم قابل جوہر ہے اس کا خیال رکھنا۔

آپ کے والد گرامی نیشا پور سے بغداد پھر وہاں سے حجاز، شام ہوتے ہوتے زنجان آئے، وہاں سے قونیہ میں آکر قیام کیا، آپ کے والد گرامی نے اپنے ایک خاص عقیدت مند عظیم عالم سید برہان الدین سے فرمایا کہ اس بچے کی تربیت کرنا سید برہان الدین نے انتہائی سعادت سمجھ کر یہ خدمت قبول کی، آپ نے اکثر علوم و فنون انہیں سید برہان الدین سے ہی حاصل کیئے، اپنے والد گرامی شیخ بہاء الدین کے وصال کے بعد دوسرے سال ۲۵/ برس کی عمر میں شام کے مشہور مدرسہ جلاویہ میں مقیم رہے، اسی عمر میں آپ کے علم و فضل کا چرچا ہو گیا، مشکل سے مشکل مسائل کا حل لوگ مولانا رومی سے حل کراتے، کچھ عرصہ بعد سیدنا برہان الدین علیہ الرحمہ قونیہ آئے اور اپنے عزیز شاگرد مولانا رومی سے ملاقات ہوئی تو دونوں استاذ شاگرد نہایت پیار و محبت سے ملے۔ مولانا سید برہان الدین نے مولانا کا امتحان لیا اور کامیاب پایا تو فرمایا کہ بیٹے تمہارے والد کی امانت میرے پاس ہے جو تمہیں دینا چاہتا ہوں، ان سے بھی فیض لیا مگر درحقیقت حضرت مولانا کا روحانی دور حضرت شمس تبریزی کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے، شمس تبریز علیہ الرحمہ کے قونیہ آنے کا زبردست شہرہ ہوا، لوگ زیارت کیلئے بے چین تھے۔ حضرت مولانا ہی ان کی زیارت کو چلے اور سرائے کے دروازے پر پہنچے۔ حضرت شمس تبریز نے بھی دیکھ لیا کہ جوہر قابل ہے، امانتوں کو

سنبھال سکتا ہے، اسرار الٰہیہ کی پاسداری کرسکتا ہے، دونوں بزرگ ملے دیر تک زبان حال سے باتیں ہوتی رہیں، دوران گفتگو حضرت شمس تبریز نے حضرت بایزید بسطامی اور حضور ﷺ کا ذکر خیر کیا تو مولانا رومی علیہ الرحمہ نے عرض کی، بایزید بسطانی بہت بڑے بزرگ تھے مگر مقام ولایت میں وہ ایک خاص درجہ پر ٹھہرے ہوئے تھے اور حضور ﷺ اپنی شان نبوت کے ساتھ ہر لمحہ بڑھتے چڑھتے گئے، جس کی دلیل ہے ''وللاخرۃ خیر لك من الاولیٰ'' محبوب آپ کا ہر لمحہ پچھلے لمحہ سے بڑھ کر ہے۔

حضرت مولانا اور شمس تبریزی کئی ماہ تک چلہ کش رہے اس دوران مولانا کے وجود میں سخت کمزوری پیدا ہوگئی، درس وتدریس کا مشغلہ کمزور پڑ گیا، شہر میں چرچا ہوگیا مولانا پر شمس تبریزی نے کوئی جادو کردیا ہے اس شور پر شمس تبریزی کو محسوس ہوا کہیں میرے خلاف فتنہ بڑھ نہ جائے، آپ وہاں سے دمشق چلے گئے، حضرت مولانا رومی کو ان کے جانے سے سخت صدمہ ہوا آپ کی حالت کو دیکھ کر وہ لوگ جنہوں نے حضرت تبریزی کے خلاف باتیں کہی تھیں، شرمسار ہوئے اور مولانا سے معافی مانگی، شمس تبریزی کو واپس لانے کیلئے ایک جماعت تیار ہوئی اور مولانا کا خط لے کر لوگ دمشق پہنچے۔ حضرت تبریزی کا پتہ کیا، اس خط کے ساتھ ایک ہزار دینار نذرانہ دیا، حضرت تبریزی نے فرمایا مجھے ان نذرانوں کی ضرورت نہیں، مولانا کا پیام کافی ہے۔

حضرت شمس تبریزی چند دنوں بعد مولانا رومی کی درخواست پر تونیہ تشریف لائے ان کی آمد پر حضرت مولانا رومی نے زبردست استقبال کیا، کچھ دیر بعد پھر پہلے کی طرح حضرت تبریزی کے خلاف باتیں شروع ہوگئیں تو آپ پھر قونیہ سے غائب ہوگئے، بعض نے کہا انہیں شہید کردیا گیا، حضرت مولانا رومی کی ریاضت، عبادت،

مجاہدہ مثالی تھا، بارہا ایسا ہوا عشاء کی دو رکعتیں شروع کی ہیں تو انہیں دو رکعتوں میں فجر ہو گئی، نماز میں روتے روتے بے خود ہو جاتے، سجدہ اتنا لمبا ہو جاتا کہ ساری رات گزر جاتی، درویشی کا یہ عالم تھا کسی دن گھر میں کھانے کا سامان نہ ہوتا تو فرماتے آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے، فیاض اور صدقہ خیرات کا یہ عالم تھا اگر کسی سائل نے کچھ مانگا ہے اور وہ شے پاس نہیں تو کرتہ اُتار کر دے دیتے، حوصلہ درگزر کا یہ عالم تھا کسی ظالم نے آپ کو شدید غلیظ گالیں دیں آپ نے سن کر مسکرا کر فرمایا میں اس سے اتفاق کرتا ہوں وہ شرمسار ہوا معافی مانگی، سماع سے خاص دلچسپی تھی، محفل سماع میں وجد طاری ہو جاتا تو کئی کئی دن ہوش میں نہ آتے تھے، بے خودی مسلط رہتی تھی، آپ کے وصال سے پہلے قونیہ میں زلزلہ آیا اور مسلسل چالیس دن تک رہا، لوگ پریشان ہوئے، مولانا کے حضور آئے اور درخواست کی، توجہ فرمائیں کہ زلزلہ رُک جائے آپ نے فرمایا زمین بھوکی ہے اور لقمہ تر چاہتی ہے اور لقمہ تر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی چند دن بعد ہی حضرت مولانا علیہ الرحمہ شدید بیمار ہو گئے لوگ جوق درجوق بیمار پرسی کیلئے آئے، آپ کی حالت بیماری سے لوگ پریشان تھے۔ ۶۷۳ھ کو آپ کا وصال ہوا۔ انا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم

غور وفکر سے پڑھا جائے

مثنوی شریف کے مطالعہ سے بعض مقامات پر محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کا یہ شعر شریعت سے ہٹا ہوا ہے مگر یہ صورت قطعی نہیں بعض لوگوں نے ایسا کیا ہے کہ فلاں جگہ شریعت کی مخالفت ہے مثنوی پڑھنے کیلئے حوصلہ، ہمت اور غور وخوض کی ضرورت ہے، اول تو ایسے اشعار کی تشریح مثنوی شریف کے اندر ہی مل جاتی ہے اگر پڑھنے والے کو اس کی تشریح نہ مل سکے تو پھر ضروری ہے کہ کسی عالم باعمل اور صاحب شریعت صوفی سے مفہوم سمجھ لے اور مولانا کو خلاف شریعت کہنے کا نشانہ نہ بنائے، اس کتاب کے سمجھنے کیلئے علمی استعداد کا ہونا بڑا ہی ضروری ہے۔

حضرت مولانا نے اصلاح نفس کیلئے اس کتاب میں عشق ومحبت کے عنوان کو بڑی اہمیت دی ہے مگر اصلاح نفس دل کی صفائی کیلئے بہت سے عنوانات کو اس کے اندر سمویا ہے وہ سارے عنوانات، تشبیہات وتمثیلات کے انداز میں غور سے پڑھنے والے کو مل جاتے ہیں، مجھے افسوس ہے میں اپنی کمزوری، کم علمی کے باعث اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کر سکا۔

چیدہ چیدہ مقامات سے فائدہ اُٹھایا، مولانا نے اصلاح نفس کیلئے اہل اللہ کی صحبت ان سے محبت کے عنوان کو بڑی اہمیت دی ہے، رفعت و بلندی تک جانے کیلئے اپنے نفس و وجود کی فنا پر تبصرہ کیا ہے، اپنی اصلاح کیلئے غلط قسم کے صوفیوں سے بچنے کی تاکید کی ہے، روحانیت حاصل کرنے کیلئے عقل وفکر وعمل سے زندگی گزارنے پر تبصرہ کیا ہے، روحانیت کے حصول کیلئے اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کرنے پر زور دیا ہے،

اپنے ذوق ومحبت کوعروج پر پہنچانے کیلئے عبادت واطاعت کے اصول کومرکزی مقام دیا ہے، صوفیاء کوریا کاری اور دکھاوے کے عمل سے بچنے پر سخت تاکید کی ہے، اُن عابدوں پر شدید گرفت کی ہے جو جنت کے شوق میں اور دوزخ کے ڈر میں عبادت کرتے ہیں۔صوفی کیلئے ذکروفکر کی اہمیت پر تبصرہ کیا ہے، دلوں کی اصلاح کیلئے تقویٰ پرہیزگاری کولازمی قرار دیا ہے۔فِکر پر جمود طاری ہوجائے تواس کیلئے ذکر الٰہی کے عمل کولازمی کہا ہے، بقا کی منزلوں تک جانے کیلئے اپنی فنا کولازمی قرار دیا، روحانی مدارج طے کرنے کیلئے علم شریعت کی اہمیت پرزور دیا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بشنو از نے چوں حکایت مے کند

وز جدائیہا شکایت مے کند

لفظی ترجمہ تو یہی ہے کہ بانسری کی بات سن وہ کیا کہتی ہے اور ہجر و فراق کی شکایت کرتی ہے۔

مولانا جلال الدین علیہ الرحمہ نے یہاں ''نے'' سے مراد روح لی ہے کہ روح کی آہ و فغاں سن کہ اُسے عالم ارواح سے عالم اجسام میں آنے پر کیا گزری، اُس عالم میں یہ قرب خداوندی کے کمالات سے بہرہ ور تھی، سعادت کے کمالات سے منور تھی، خدائے قدوس کے چاہنے سے اسے عالم اجسام میں آنا پڑا جس میں کئی قسم کی خرابیاں تھیں، ظاہر ہے اس میں عالم ارواح کی نسبت خاصہ نقصان ہوا اس کمی کو عوام کی روحیں محسوس نہیں کرتیں، ہاں جس دل سے غفلت کا پردہ اُٹھ گیا تو اس کی روح کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے بلند مقام سے نیچے آئی ہے اور کتنی سعادتوں سے محروم ہو گئی ہے اور کس قدر آلائشوں میں پھنس گئی ہے، اور اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے وطن جانا کس قدر گراں گزرا ہے، جلاوطنی کا صدمہ کس قدر ہے۔

انہیں حالات کے پیش نظر روح روئی ہے اور اپنے ہجر و فراق کا ذکر کرتی ہے مشیت خداوندی کے تحت روح کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور جسم کے ملک میں آ کر ڈیرہ ڈالنا پڑا، اسی صدمہ نے اسے رونے چلانے پر مجبور کیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح طیبات عام انسانی روحوں سے بالکل مختلف ہیں کہ وہ اس دنیا میں آ

کر یہاں کی آب و ہوا گناہوں، خطاؤں سے ملوث نہیں ہوتیں، یہاں ''نے'' سے مراد ہر نیک روح ہے جو وصل محبوب کیلئے بے قرار ہے بعض حضرات نے یہاں ''نے'' سے مراد بانسری لی ہے جس کی آواز دل سوزی کیلئے مشہور ہے، اب یہ معنی ہوگا بانسری سے سن کہ وہ کیا کہتی ہے اور کس طرح جدائیوں کی شکایت کرتی ہے جب سے اُسے بوٹے سے کاٹا گیا اسی وقت سے مرد، عورت میرے نالوں سے ڈرتے ہیں، روح عالم ارواح میں اپنی اصل یعنی ذات حق میں لوٹنے کی مشتاق ہے جو اس راز کو سمجھتا ہے وہی میرے نالے کی اصل کو بھی سمجھتا ہے، بدن روح سے اور روح بدن سے چھپے ہوئے نہیں لیکن کسی کے پاس روح کو دیکھنے کا دستور نہیں، بانسری خطرناک راستے کی بات کرتی ہے یعنی مجنوں کے عشق کے قصے بیان کرتی ہے اس دنیا میں جو لوگ عشق کے زیر اثر آہ و فریاد کرتے ہیں، دراصل اس کا منبع ذات الٰہی ہے، بانسری کی آواز اُسی کی پھونکوں کی وجہ سے ہے اور روح کی بے تابی اسی کی کشش کی وجہ سے ہے، فراق میں عمریں گزر گئیں، گزرتی ہیں تو کہہ دو گزر جائیں، اگر محبوب پاتی ہے تو فراق کے غم کی کوئی پرواہ نہیں جیسے مچھلی دریا کے پانی سے کبھی سیر نہیں ہوتی ایسے ہی عاشق کبھی دریائے عشق سے سیر نہیں ہوتا اور قرب کا متلاشی رہتا ہے کوئی ناقص کسی کامل کا حال نہیں جان سکتا، عشق صادق کا جوش شراب کے جوش سے کہیں زیادہ ہے کہ عاشق بحر وحدت کا غوطہ خور ہے، عاشقوں کی کیفیات بھی عام لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں، جنون عشق سے بڑھ کر روحانی بیماریوں کا کوئی معالج نہیں، موسیٰ علیہ السلام کا طور پر جانا طور کا مست ہو کر لرزنا اس پر زلزلہ برپا ہو جانا، عشق کا ہی کرشمہ ہے، عشق طور کی جان بن گیا، طور مست ہو گیا، موسیٰ علیہ السلام بے خود ہو گئے، یہ عشق کا ہی کارنامہ ہے، حقیقت

یہ ہے کہ تمام کائنات معشوق ہے اور عاشق پردہ ہے معشوق زندہ ہے اور عاشق مردہ ہے، جب رحمت خداوندی بندہ کے شامل حال نہ ہو تو وہ بے بال و پر کا پرندہ ہے ہمارے بال و پر اس کی عشق کے کمند ہیں جو کھینچتی ہوئی ہمیں دوست کے کوچہ تک لے جاتی ہے۔

کز نیستاں تا مراد ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

جب سے مجھے "نے" کی زمین سے کاٹ کر جدا کیا گیا ہے میری آہ و فغاں سے مرد عورت رو رہے ہیں۔

مولانا روم علیہ الرحمہ نے روح کو "نے" سے تعبیر کیا ہے اور عالم ارواح کو نیستاں قرار دیا ہے، مفہوم یوں ہوگا کہ روح کی "نے" روتی ہے اور کہتی ہے جب سے مجھے عالم ارواح سے جدا کر کے اس عالم ناسوت میں قید کر دیا گیا ہے اُسی وقت سے میں اپنے فضائل و کمالات کے کم ہو جانے پر رو رہی ہوں کہ تمام سننے والے مرد عورت میری حالت پر رحم کر کے رو رہے ہیں۔

سینہ خواہم شرح شرح از فراق
تا بگوئیم شرح درد اشتیاق

"نے" کہتی ہے میں اپنا دکھ درد سنانے کیلئے ایسا سینہ چاہتی ہوں جو میری دردبھری کہانی سننے سے پہلے درد و فراق کے باعث پہلے ہی پارہ پارہ ہو، اس لئے کہ دردبھری کہانی سننے کا لطف وہی اُٹھا سکتا ہے جو درد سے آشنا ہو۔ درد و عشق سے بے

بہرہ درد کی کہانی سے متاثر نہیں ہوسکتا اور نہ ہی داستان غم اُسے اپنی طرف متوجہ کرسکتی ہے بے ذوق بے درد آدمی کو اپنا دکھ سنانا بے فائدہ ہے ''نے'' کہتی ہے میں اپنا دکھ اس بادرد انسان کو سنانا چاہتی ہوں جو میرا درد سننے سے پہلے ہی فراق کی کیفیت سے واقف ہو پھر میرے سنانے میں بھی مزہ ہے اور اس کے سننے میں بھی، اس لئے کہ تندرست آدمی کو کسی زخمی کے درد کا احساس نہیں ہوسکتا۔

ہر کسے کو درد ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

اس لئے ہر شخص جو اپنے اصل سے دور رہ جاتا ہے وہ پھر چاہتا ہے کہ اپنے اس مبارک دور کو پالے جو کبھی اسے نصیب تھا اور اس حسین وقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے کہ جب کوئی اپنے اصل سے محروم ہوتا ہے اور دوری کی مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو وہ اپنی اس بے قراری کو دور کرنے کیلئے اپنے اصلی وطن جانے کیلئے پوری طرح تگ ودو کرتا ہے یہی حال روح کا ہے جب وہ دیکھتی ہے کہ عالم ارواح کی صفات وکمالات سے محروم ہے تو پھر وہ اپنے اُسی عالم کیف وسرور کو پانے کیلئے بے تاب رہتی ہے۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم
جفت خوشحالاں و بد حالاں شدم

مولانا رومی علیہ الرحمہ نے اس شعر میں روح کی ایک بات کی طرف اشارہ کیا ہے، روح کہتی ہے، میں ہر قسم کی محفل میں رہ چکی ہوں جو لوگ ''نے'' کے نالہ سے

ذوق محسوس کرتے ہیں وہ خوشحال ہیں، میں ان میں بھی رہ چکی ہوں اور جو لوگ جسم کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں وہ بدحال لوگ ہیں، میں ان میں بھی رہ چکی ہوں یعنی مجھے ان لوگوں سے ملنے کا بھی موقعہ ملا ہے، جنہوں نے میری چیخ و پکار سے کسی قسم کا اثر قبول نہیں کیا اور ایسے لوگوں سے بھی ملنے کا موقعہ ملا ہے جن پر میرے رونے چلّانے سے رقت طاری ہوگئی۔

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نہ جست اسرار من

حضرت مولانا علیہ الرحمہ روح کی ایک اور بات کو بیان فرمارہے ہیں، روح نے کہا ہر شخص اپنی سوچ فکر کے مطابق میرا دوست رہا حالانکہ اس نے میرے دل کے رازوں کو نہیں پایا جن سے مجھے تعلق کا واسطہ پڑا، وہ اس درد سے آشنا نہ تھے وہ جن باتوں کو غم اور درد سمجھتے تھے انہوں نے مجھے بھی اسی قسم کے درد میں مبتلا سمجھ کر ہمدردی کی مگر حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے میرے اصلی دکھ کو سمجھا ہی نہیں۔ یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے، خدا ہی خوب واقف ہے کہ کس پر کیا گزرتی ہے۔

سر من از نالہ من دور نیست
لیک چشم و گوش را آن نور نیست

اس شعر میں مولانا علیہ الرحمہ نے ''نے'' کی روح کی ایک اور فریاد کا ذکر فرمایا ہے کہ میرا بھید میری عجز و انکساری سے دور نہیں ہے، مگر لوگوں کی آنکھیں اور اُن کے کانوں کو اتنی ہمت ہی نہیں کہ جس سے میری حالت کو دیکھ کر میری آہ وزاری کے راز کو سمجھ سکیں

یعنی جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں وہ میرے اصلی درد کو معلوم ہی نہیں کر سکے، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ ان کی علمی کمی اور اُن کے ذوق و محبت کا خسارہ ان کی نگاہوں میں وہ روشنی نہیں کہ حقیقت کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھ سکیں، ان کے کان بہرے ہیں کہ اُن پر حقیقت واضح نہیں، ایسے ہی ان کے دلوں پر پردے ہیں کہ وہ میرے رازوں سے آشنا نہیں ہو سکے، اگر اُن کے دلوں میں ذوق کا ذرہ بھی ہوتا تو وہ میرے آہ و فغاں کے راز کو جان جاتے اور جو کیفیت میری آہ و زاری سے واضح ہے ان پر کھل جاتی۔

تن زجان و جان ز تن مستور نیست
لیک کس را دید جاں دستور نیست

پچھلے شعر میں ذکر تھا کہ میرا بھید میرے نالہ سے دور نہ ہونے کے باوجود لوگوں کو سمجھ نہیں آ رہا تو حیرت کی بات نہیں اس پر تعجب نہ کیا جائے کہ قریب ہونے کے باوجود سمجھ سے بالاتر کیوں ہے یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے جسم اور روح قریب ہیں مگر اُسے دیکھا نہیں جا سکتا ایسے ہی یہ صورت ہے کہ میرا راز، میرے نالہ میری آہ و زاری سے دور نہیں مگر دیکھا نہیں جا سکتا۔

آتش ست ایں بانگ نائے نیست باد
ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

مولانا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ بانسری کی آواز ایک جلا دینے والی آگ ہے محض ہوا نہیں ہے اور جس شخص کو یہ آگ میسر نہیں خدا کرے وہ نیست و نابود ہو جائے۔ اس

شعر کا ظاہری معنی تو آپ نے پڑھ لیا اس شعر کا صوفیانہ معنی یہ ہے اہل علم با کمال لوگوں کے قول و فعل کو بے اثر پھونک نہ تصور کیا جائے بلکہ ان کے قول و فعل کی ہوا ایک شعلہ زن آگ ہے جو اس کے سامنے آجاتا ہے اس کو بھی اپنی طرح جلا دیتی ہے اور روشنی دیتی ہے گویا اس شعر میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے ان لوگوں پر افسوس کیا ہے جو اس آگ سے محروم ہیں، بعض پتھر بھی خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور ان انسانوں پر خشیت خداوندی کا کوئی اثر نہیں۔

آتش عشق ست کاندر نے فتاد
جوشش عشق است کاندر مے فتاد

اس شعر میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے بانسری کی آواز کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ آگ عشق ہی کی ہے جو بانسری میں لگ رہی ہے اور فرماتے ہیں یہ جوش عشق ہی کا ہے جو شراب میں برپا ہے، معنی یہ ہوگا کہ بانسری جس سے دردوسوز ظاہر ہے اس سے مراد عاشق ہے اور شراب جو دوسروں کو مست بناتی ہے اس سے مراد معشوق حقیقی ہے، عاشق و معشوق دونوں عشق سے متاثر ہیں، اگر معشوق میں عشق نہ ہوتا تو اکیلے عاشق کے عشق سے کیا ہوتا؟ کچھ بھی نہ ہوتا۔

بعض اہل محبت نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ حقیقت میں معشوق ہی قصہ عشق کا آغاز ہے اور عاشق کی حالت معشوق ہی کی شان کا ایک پَرتَو ہے۔

نے حریف ہر کہ از یارے برید
پرد ہائش پردہ ہائے مادرید

حضرت مولانا روم علیہ الرحمہ نے بانسری کے بارہ میں ایک باذوق بات بتائی ہے کہ بانسری عاشق صادق کی غمخوار ہے اس کے سروں نے ہمارے دل کے پردے اٹھادیئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ''نے'' بانسری خود اپنے وطن سے دور درد وفراق میں مبتلا ہورہی ہے، اس لئے وہ ایسے شخص کی صحبت کو پسند کرتی ہے جو اُسی کی طرح فراق میں مبتلا ہو جیسے اس نے پہلے ہی کہا ہے میں ایسا شخص چاہتی ہوں جس کا سینہ دوردوفراق سے چھلنی ہو۔

دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں چونکہ ہم ابھی فراق کی گرفتاری کی وجہ سے ان سامعین میں سے ہے جن کی صحبت بانسری کو پسند ہے، اس لئے اس کے سُر ہم پر خاص اثر کر جاتے ہیں اور انہوں نے ہمارے دل سے وہ حجاب اُٹھا دیئے ہیں جو محبوب کی یاد میں رکاوٹ تھے۔

ہمچو نے زہرے و تریاقے کے دید
ہمچو نے دمساز و مشتاقے کہ دید

بانسری کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ بانسری کا زہر وتریاق کس نے دیکھا ہے؟ بانسری کا سا رفیق ومشتاق کس نے دیکھا ہے؟ ''نے'' کی ایک صورت حال کو بیان فرماتے ہیں اگر نے سے مراد مرد کامل لیا جائے تو وہ خود اپنے حق میں زہر قاتل بھی ہے کہ اپنے کو فنا کررہا ہے اور وہی مرد کامل تریاق بھی ہے کہ وہ فنافی اللہ کے بعد بقاباللہ کی منزل بھی پار رہا ہے اگر اس سے مراد ظاہری ''نَے'' ہے تو پھر معنی یہ ہوگا کہ اس کی آہ وفغاں سننے والوں کو لذتوں کو چھوڑنے اور کمالات حاصل کرنے کی طرف توجہ دلا رہی ہے۔

نَے حدیث راہ پرخوں مے کند
قصہ ہائے عشق مجنوں مے کند

مولانا بانسری کی ایک اور حالت کو بیان فرماتے ہیں کہ وہ عشق کے مشکل اور پرخطر راہوں کا حال سناتی ہے اور مجنوں کے عشق کے قصے بیان کرتی ہے، وہ بتاتی ہے سلوک کی راہیں بہت پرخطر ہیں اور مشکلات ومصائب سے بھری ہوئی ہیں اور وہ ایسے عاشقوں کے عشق کی داستان سناتی ہے جن کے دل میں محبوب کے بغیر کسی اور کا قطعی تصور ہی نہیں رہتا۔

دو دہاں ڈریم گویا ہم چو نَے
یک دہاں پنہاں ست در لبہائے وے

اس شعر میں اپنے کو ''نَے'' (بانسری سے) تشبیہ دی ہے فرماتے ہیں جیسے بانسری کی حالت ہے کہ اس کا ایک سوراخ بانسری بجانے والے کے لبوں میں چھپا ہوتا ہے اور ایک سوراخ پر اُسے بجانے والا بجانے کی غرض سے پھونک مارتا ہے اور دوسرے سوراخ سے بانسری کی آواز نکلتی ہے اس اعتبار سے مولانا فرماتے ہیں ہمارے بھی دو منہ ہیں ایک منہ فیاض مطلق سے ملا ہوا ہے جس کے ذریعہ حقیقت کا پردہ اُٹھا ہوتا ہے دوسرے منہ کا ذکر اگلے شعر میں فرمایا گیا ہے۔

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما
ہائے و ہوئے در فگندہ در سماء

یعنی دوسرا منہ تمہاری طرف آہ وفریاد کر رہا ہے یہاں تک کہ آسمان میں بھی شور برپا کردیا، ایک منہ تو واصل ہو کر اسرار کا انکشاف کر رہا ہے اور دوسرے منہ سے ہم ان اسرار کو زمین و آسمان میں نشر کر رہے ہیں جس سے لاپرواہ غافل اور کم سوچ والے لوگوں میں کہرام مچ رہا ہے۔

لیک داند ہر کہ او را منظر ست

کایں فغان ایں سرے ہم زاں سر ہست

اس شعر میں مولانا فرماتے ہیں جو شخص دانائی، معرفت اور حق پہچاننے کی نعمت سے نوازا گیا ہے وہ جانتا ہے کہ ایک سرے کا نالہ وفغاں بھی اُسی سرے سے ہے عام لوگوں کو یہ خیال نہیں آسکتا کہ اولیاء اللہ کی شان بھی شان پیغمبری کا پَرتَو ہوتی ہے، اور شان نبوت یہ ہے کہ وہ اللہ کی مرضی کے بغیر کوئی بات ہی نہیں کرتے، ولی کامل کی آواز بھی خدا کی آواز ہے اور اس کی خاموشی خدا کا راز ہے۔

و مدمہ ایں نائے از دمہائے اوست

ہائے و ہوئے روح از تنبیہائے اوست

اس سے پہلے شعر میں یہ ذکر تھا کہ صاحب بصیرت اہل دل جانتا ہے کہ نَے کے اس سرے کی آواز بھی اُسی سرے کی ہے جو بانسری بجانے والے کے لبوں میں ہے اس شعر میں پہلے شعر کے مفہوم کی تکمیل ہے کہ وہ جانتا ہے کہ نَے کی آواز نَے نواز ہی کی پھونک کا اثر ہے۔ نَے کا ذکر تو محض مثال کے طور پر تھا فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ روح کی آواز بھی اُسی موثر حقیقی کی تنبیہات کا نتیجہ ہے۔

محرم ایں ہوش جز بے ہوش نیست
مرز بانرا مشتری چوں گوش نیست

اس شعر میں مولانا فرماتے ہیں سچے ہوش یعنی عشق وصحبت کا واقف ہونا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں عشق ومحبت کے راز کو صرف وہی معلوم کر سکتا ہے جو ماسوی اللہ سے بے ہوش ہو، فرماتے ہیں جیسے زبان کی باتوں کا خریدار کان کے برابر کوئی نہیں ایسے ہی نَے کے آہ وفغاں کرنے کے راز کو وہی سمجھ سکتا ہے، جس کے دل کو محبت کے جذبہ نے ماسوی اللہ سے پاک کر دیا ہے اور معاش سے بے خبر کر دیا ہے، اس شعر میں فرمایا ہے جیسے زبان کی باتوں کے احساس کا اہل، کان ہوتا ہے ناک آنکھ نہیں ایسے ہی قصہ عشق کے سننے اور سمجھنے کا اہل وہی شخص ہوتا ہے جو سفلی احساسات سے پاک ہو۔

گر نبودے نالۂ نَے را ثمر
نَے جہاں پر فکر دلے از شکر

اوپر کے شعر میں حضرت مولانا نے فرمایا کہ نَے کی آواز حقیقی نے نواز کے بہانے جاں بخش کا کرشمہ ہے اَب اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں دلیل فرمارہے ہیں اگر نَے کی آواز کا کسی سلسلہ غیب سے تعلق نہیں ہے تو ہمارا عالم جو آج معرفت کی حلاوت سے لذت گیر ہورہا ہے، یہ کیسے ہوگیا۔اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نَے کی آواز کا کوئی نتیجہ نہ ہوتا تو جہاں معرفت کی شکر سے بھرپور کیسے ہوتا۔

در غم ما روزہا بیگاہ شد

روزہا با سوز ہا ہمراہ شد

نَے کی آہ وزاری اور عجز وانکساری کی حالت کا ذکر فرماتے ہیں کہ ہمارے غم واندوہ مقدس وپاکیزہ حالات ضائع ہوگئے اور عمر سوز وگداز میں کٹ گئی رب قدوس جل مجدہٗ کی بے پناہ عنایات سے جو نورانی حالات وارد ہوئے تھے جو سالک کیلئے ایک عظیم دولت ہے، بے پایاں نعمت ہے عشق کے غم نے ان کی کیفیت سے فائدہ نہ اُٹھانے دیا اور بالآخر یونہی دن گذر گئے۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست

تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

پہلے شعر میں عشق کی کیفیت سے لذت گیر نہ ہونے کے صدمہ کا ذکر کیا تھا، اس شعر میں اپنے کو حوصلہ دیتے ہوئے کہتے ہیں اگر وہ پاکیزہ حالات جاتے رہے ہیں تو حوصلہ کر، چلے جائیں کوئی مضائقہ نہیں، اے محبوب گرامی! اگر تو پاس ہے تو پھر کسی قسم کی پرواہ نہیں، پہلے شعر میں اپنی کمزوری کم ہمتی اور پستی کا ذکر کیا تھا، اس شعر میں اپنی حالت پر اطمینان ذکر کیا ہے۔ مولانا اپنے محبوب حقیقی سے خطاب کر کے فرماتے ہیں اے مقدس محبوب! اگر تو ہمارے پاس ہے تو پھر پرواہ کاہے کی، تیرا وجود وشہود ہی سالک کی منزل ہے۔۔۔۔

ہر کہ جز ماہی ز آبش سیر شد
ہر کہ بے رو زیست روزش دیر شد

اس شعر میں مولانا عاشق کو مچھلی سے تعبیر کرتے ،فرماتے ہیں کہ عاشقِ حق کے سوا جولوگ ہیں وہ اس تھوڑے سے پانی سے بھی سیر ہو جاتے ہیں اور جو بالکل محروم ہیں ان کے تو اوقات ہی بر باد ہو گئے ،اس شعر میں مولانا نے سالکوں کی تین قسموں کا ذکر کیا ہے ایک کو مچھلی سے تعبیر کیا ، دوسرے عام مسلمان جنہیں مچھلی کے سوا ذکر کیا تیسرے وہ جو شریعت مطہرہ کی تعلیمات سے بے بہرہ ہیں، پانی سے مراد کلام الٰہی ہے جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتا ہے۔

در نیا بد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

فرماتے ہیں کوئی ناقص آدمی کامل آدمی کا حال معلوم نہیں کر سکتا، معاملہ ختم کر دینا چاہئے اور ہمارا سلام ہے۔

اس شعر میں مولانا نے درد و عشق ،محبت ، پیار سے متعلق فرمایا ہے کہ یہ مضبوط طاقت ور لوگوں کے حالات ہیں جو محبوب کے مشاہدہ کے دریا میں مچھلی کی طرح ہیں اور ناقص لوگ ان حالات کو معلوم نہیں کر سکے کہ یہ لوگ تو رحمت کے ایک چلو بھر پانی سے سیراب ہونے والے ہیں اور کامل مرد کے حالات ایک بے کنار دریا ہے، نا اہل لوگوں کے سامنے قصہ عشق بیان کرنا مناسب نہیں رہا ان لوگوں کا قصہ جو محروم ہیں ان کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ اس کیفیت سے آشنا ہی نہیں۔

بادہ در جوشش گدائے جوشِ ماست
چرخ در گردش اسیر ہوش ماست

اوپر کے شعر میں مولانا نے اولیاء کاملین کے عشق کی منزلوں کا ذکر کیا تھا اس شعر میں اپنی حالت ذکر فرماتے ہیں کہ آپ ہی اُنہیں کاملین میں سے ایک فرد ہیں، فرماتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ شراب جوش لانے میں مشہور ہے مگر شراب نے بھی یہ جوش ہمیں سے مانگ کر لیا ہے یہ بھی ٹھیک ہے کہ آسمان گردش میں سب پر حاوی ہے مگر سچ یہی ہے کہ ہماری روح پر وہ بھی فریفتہ ہے، کہ ہماری روح عشق کی منزلوں میں بہت تیز حرکت والی ہے۔

بادہ از ما مست شد نے ما ازو
قالب از ما ہست شد نے ما ازو

پہلے شعر کے مفہوم کو پھر دوسری مرتبہ دوسرے انداز میں ارشاد فرماتے ہیں کہ شراب ہم سے مست ہوئی ہے ہم شراب سے مست نہیں، فرماتے ہیں یہ تصور صحیح نہیں کہ شراب نے شراب پینے والے کو مست کیا ہے سچ یہ ہے کہ ہماری حالت نے اس میں داخل ہو کر اس کو مست کر دیا ہے، ہماری زندگی اس پر موقوف نہیں بلکہ وہ مستی ہماری زندگی پر موقوف ہے۔

چل رہی ہے جس سے جسمانی مشین
کوئی پوشیدہ کمانی اور ہے

بر سماع راست ہر کس چیز نیست
طُعمہ ہر مرغکے انجیر نیست

پہلے شعر میں یہ تھا کہ عشق کی منزلوں کا تذکرہ عوام کے آگے بیان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ جب اُنہیں سننے کی طاقت ہی نہیں تو سنانے سے فائدہ کیا، اسی مؤقف کی تائید میں یہ فرمایا کہ سچی بات سننے کی طاقت ہر شخص کو نہیں اگر کسی کم علم، کم عقل شخص کے سامنے عشق و محبت کی منزلوں کا ذکر کیا جائے تو وہ شک وشبہات میں مبتلا ہو کر برباد ہوگا اسی عنوان کی تائید میں یہ فرمایا کہ ہر شخص حقائق سننے کی طاقت نہیں رکھتا جیسے ہر پرندے کی خوراک انجیر نہیں ہوسکتی ایسے ہی ہر شخص عشق و معرفت کی رموز جاننے کا اہل نہیں۔

بند بگسل باش آزاد اے پسر
چند باشی بندِ سیم و بندِ زر

اوپر کے شعروں میں ذکر تھا کہ اعلیٰ معیار کے لوگوں کے حالات کم درجہ کے لوگ نہیں سمجھ سکتے ،اب اس شعر میں حضرت مولانا ایک ضابطہ بتا رہے ہیں جس سے خامی دور ہو جائے اور اُن لوگوں میں عشق و محبت کے اسرار سمجھنے کی طاقت پیدا ہو جائے ،مولانا نے اس عظیم نعمت کو حاصل کرنے کیلئے جو اصول بیان کیا وہ یہ ہے کہ آدمی کو چاہئے اللہ کے بغیر تمام تعلقات کو ختم کر دے،سونے چاندی مال و دولت کی قید سے آزاد ہو جائے جب یہ کیفیت ہو جائے گی تو عشق و محبت کے اسرار بھی سمجھ آنے لگ جائیں گے۔

گر بریزی بحر را در کوزہ
چند گنجد قسمتِ یک روزہ

اس شعر میں حضرت مولانا نے چاندی سونے کو ضرورت سے زیادہ اکٹھا کرنے کی مذمت کی ہے فرماتے ہیں یہ سامان زندگی تو صرف اسی قدر چاہئے جس سے ضرورت پوری ہوجائے اس شعر میں حرص کی مذمت کی گئی ہے کفائت شعاری کے اصول کو بیان کیا گیا ہے، مثال دے کر سمجھایا گیا ہے کہ اگر تو چاہے کہ سمندر کو کوزے میں ڈالے تو کیسے ممکن ہے سارے سمندر کا پانی کیسے ڈالا جا سکتا ہے، ایسے ہی تیری حرص ہے ضرورت کا کپڑا گزراوقات کیلئے روٹی کا خیال تیرے اندر صبر، توکل کو فروغ دے گا۔

کوزۂ چشم حریصاں پر نشد
تا صد قانع نشد پُر دُر نشد

اس شعر میں دنیا کے حریص کو مثال دے کر سمجھایا گیا ہے کہ حریص کی آنکھ سیر نہیں ہوتی یہ آنکھ اس کا ایک پیالہ ہے جو پُر نہیں ہوگا، پھر دوسرے مصرعہ میں فرمایا جب تک سیپ پانی کے ایک قطرہ پر اکتفا کر کے منہ بند نہیں کر لیتا اپنے اندر موتی بننے کی دولت سے محروم ہوتا ہے پہلے مصرعہ میں ذکر تھا حریص آنکھ کو جتنا بھی مال مل جائے سیر نہیں ہوتی، سیپ ایک قطرے پر قناعت کرتا ہے اور حرص سے بچتا ہے تو موتی کی دولت حاصل کر لیتا ہے۔

هر کرا جامه ز عشقے چاک شد

اوزِ حرص و عیب کلی پاک شد

اس شعر میں حضرت مولانا فرماتے ہیں اپنی اصلاح، اخلاق کی بلندی اورتہذیب نفس کیلیئے بہترین علاج عشق ہے، اخلاق بہتر بنانے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں مگر مولانا نے تمام علاجوں سے بڑھ کر کامیاب علاج جو بتایا ہے حقیقی عشق ہے جب بندہ اس میں اپنی ہستی کو فنا کر لیتا ہے تو وہ تمام قسم کی بیماریوں سے محفوظ ہوجاتا ہے پچھلے اشعار میں حرص کی بیماری کا ذکر تھا،اس بیماری کا علاج بھی عشق حقیقی ہی ہے

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

اے طبیب جملہ علتہائے ما

پچھلے شعر میں مولانا نے حرص،عیب نقائص کا علاج عشق کو بتایا ہے،اس شعر میں عشق سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں، اے عشق تو خوش رہے تو ہماری بیماریوں کا علاج ہے تو ہماری ساری اخلاقی، روحانی بیماریوں کا بہترین معالج ہے،شاندار طبیب ہے،جن بیماریوں کے علاج سے طبیب عاجز آ گئے تو ان بیماریوں کا کامیاب طبیب ہے، تیرا مرتبہ سب طبیبوں سے بلند و بالا ہے۔

اے دوائے نخوت و ناموس ما

اے تو افلاطون جالینوس ما

پہلے شعر کی طرح اس میں بھی مولانا عشق کو مخاطب کرکے بات کررہے ہیں،

فرماتے ہیں اے عشق تو ہمارے تکبر اور عزت طلبی کی دوا ہے، ہمارا افلاطون بھی تو ہی ہے اور جالینوس بھی تو ہی ہے۔ پہلے شعر میں عشق سے کہا تھا کہ تو ہماری ساری بیماریوں کا علاج ہے اس شعر میں تکبر اور جاہ طلبی کا خاص کر کے ذکر فرمایا کہ یہ بیماریاں اکثر بیماریوں کی جڑ ہیں، شیطان کو تمام قسم کے گناہوں کا موجد کہا ہے اس نے سب سے پہلے جو گناہ کیا وہ تکبر سرکشی ہے، عشق صرف اُن بیماریوں کا علاج ہی نہیں بلکہ خود افلاطون اور جالینوس کا طبیب حاذق ہے۔

جسم خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد چالاک شد

اس شعر میں مولانا نے عشق کی ایک اور عظمت کو بیان کیا ہے کہ عشق ہی کی بدولت حضور ﷺ کا سفر معراج ہوا اور آپ آسمانوں سے پار بلندیوں پر پہنچ گئے، عشق ہی کے سبب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر جلوہ گر ہوئے۔ فرماتے ہیں طور پہاڑ کے اندر وجد اور ناچنے کی کیفیت پیدا ہوئی اور اس کا سبب بھی عشق ہی تھا، عشق کی قوت کو بیان کیا کہ پہاڑ ایک پتھر ہے بے حِس ہے مگر عشق ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ حرکت میں آ گیا بلکہ عشق کی تجلی کو برداشت نہ کرتے ہوئے پارہ پارہ ہو گیا۔

عشق جانِ طور آمد عاشقاں
طور مست خرّ موسیٰ صاعقا

جیسے پہلے شعر میں عشق کی اہمیت و عظمت کو بیان کیا ہے یہ عشق ہی تھا کہ خاکی جسم آسمانوں سے باہر نکل گیا اور طور وجد میں آیا، ایسے ہی اس شعر میں فرمایا کہ طور

پر جو تجلی ڈالی گئی جس نے جان بن کر طور میں حرکت ڈال دی یہ عشق ہی تھا موسیٰ علیہ السلام جو تجلی سے بے خود ہو گئے یہ عشق ہی تھا۔ مولانا فرماتے ہیں عشق کوہ طور کی جان بن گیا اسی لئے معشوق حقیقی کے جلوے سے طور مست ہو گیا اور موسیٰ بے خود ہو گئے۔

سرّ پنہاں ست اندر زیر و بم
فاش اگر گویم جاں برہم زنم

اس شعر میں حضرت مولانا نے سُروں کے مختلف انداز کا ذکر کیا ہے کہ ان سروں کے مختلف انداز میں ایک راز چھپا ہوا ہے، اس راز کی عظمت یہ ہے اگر میں اس راز کو کھول دوں تو گویا جہان کو برباد کر ڈالوں، حضرت مولانا علیہ الرحمہ اپنے صوفیانہ مسلک میں وحدت الوجود کے قائل ہیں اور اس کے قائل ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی وجود نہیں، اگر یہ راز عوام تک جائے تو وہ سمجھ نہیں سکیں گے اور نظام عالم خراب ہوگا، اسی وجہ سے یہ راز پوشیدہ ہے جو ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔

آنچہ نَے میگوید اندر ایں دو باب
گر بگویم من جہاں گرد و خراب

اس شعر میں مولانا نے پھر پہلے شعر والے عنوان کو دہرایا ہے، فرماتے ہیں بانسری کی سُروں میں جو کچھ پوشیدہ ہے اگر میں اس کے رازوں کو واضح کر دوں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں برباد ہو جائے بانسری کے رازوں کو بار بار ذکر کرنے سے پتہ چلتا ہے مولانا بانسری کے زیر و بم سے خاصے متاثر ہیں اور اپنے ہمنواؤں کو بانسری کی کیفیات سے قریب کرنا چاہتے ہیں۔

با لبِ و مسازِ خود گر جفتمے
ہمچو نَے من گفتنیہا گفتمے

اس شعر میں مولانا افسوس کے ساتھ اپنے اندر ایک کیفیت نہ ہونے کا ذکر فرماتے ہیں کاش میں بھی اپنے یار کے لب سے ملا ہوتا تو بانسری کی طرح کچھ کہنے میں فخر محسوس کرتا اس شعر میں مولانا نے فرمایا ہے کہ کاش ہمیں بھی کسی اپنے ہم خیال ہم مسلک سے گفتگو کا موقعہ ملتا تو دل کھول کر باتیں کر لیتے عشق و محبت کی باتیں تو زبردست سربستہ راز ہیں اور یہ راز کی باتیں عام لوگوں سے کی نہیں جاسکتیں کہ وہ کہیں اپنی کم فہمی، کم علمی کے باعث سیدھی راہ سے بھٹک نہ جائیں۔

ہر کہ او از ہم زبانے شد جدا
بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

پہلے شعر میں اپنی ایک تمنا کا ذکر فرمایا کہ کاش کسی ہمنوا سے گفتگو کا موقعہ ملتا ،اس شعر میں ہم خیال نہ ملنے پر صدمہ کا اظہار کرتے ہیں کہ جس کا ہم راز جدا ہو گیا، حقیقتاً وہ بے سرو سامان ہے اگرچہ بظاہر اس کے پاس کتنا ہی سامان کیوں نہ ہو، فرماتے ہیں عشق کے رازوں کو واضح کرنے کیلئے سننے والوں میں صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔

چونکہ گل رفت و گلستاں در گذشت
نشنوی زیں پاس زبلبل سر گذشت

حضرت مولانا نے اوپر کے شعر کی مثال پیش کی ، فرماتے ہیں باغ اُجڑ جائے تو بلبل کی چہک ہی ختم ہو جاتی ہے یہ پھول ہی تھا جس کے حسن پر بلبل فریفتہ تھی پھول نہ رہے تو بلبل ہی خاموش ہو جاتی ہے، ایسے ہی سمجھو کہ مخاطب میں بات سمجھنے کی اہلیت نہ ہو اور وہ بھی عشق و محبت کے رازوں کو نہ سمجھ سکے تو ایسی صورت میں خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب
بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

پہلے شعر کی تائید میں ہی یہ شعر ہے مولانا فرماتے ہیں جب باغ ہی اُجڑ گیا تو پھر پھول کی خوشبو کیسے اور کہاں سے مل سکتی ہے، جب عشق و محبت کے رازوں کو جاننے والے ہی نہ ہوں تو پھر رازوں کو پایا کیسے جا سکتا ہے اگر کسی ایک آدھ میں کوئی ایسی قابلیت ہے ہی تو اس کی کوئی حقیقت نہیں جیسے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ باغ اُجڑنے پر بلبل کی چہک ہی نہیں سنی جاتی ایسے ہی اہل ذوق و محبت کے نہ ملنے پر عشق کے راز و نیاز بھی نہیں سمجھے جا سکتے۔

جملہ معشوق ست و عاشق پردۂ
زندہ معشوق ست و عاشق مردہ

اس سے پہلے شعر میں عشق و محبت کے راز اور وحدت الوجود کے مسئلہ کو عام لوگوں کیلئے ایک فتنہ فرمایا تھا، اس شعر میں عشق اور وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو خاص لوگوں کیلئے بیان فرمایا ہے یہ مسئلہ وحدت الوجود دیر سے صوفیاء میں اختلافی چلا آرہا ہے،

صوفیاء کے دو گروہ ہو گئے ایک گروہ وحدت الوجود کا دوسرا گروہ وحدت الشہود کا قائل سمجھا جاتا ہے۔صوفیاء کا وہ گروہ جو وحدت الوجود کا قائل ہے۔حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے اسی گروہ کی تائید میں یہ شعر لکھا ہے،فرماتے ہیں تمام موجودات عین معشوق ہیں جو ذات حق ہے اور عاشق جو تعینات ہیں، پایا جاتا ہے وہ ایک پردہ ہے اگر یہ پردہ اُٹھ جائے تو کائنات مٹ جائے اس گروہ کا نظریہ ہے کہ عاشق کا وجود اور اس کی حیات و ممات خدا ہی کی ایک شان ہے اس اہم مسئلہ پر تفصیل مطلوب ہو تو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتاویٰ عزیزیہ صہ ۱۲۴، ج ا کا مطالعہ نہایت مفید رہے گا، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے قائلین میں بڑے بڑے جلیل القدر علماء وصوفیاء پائے جاتے ہیں۔

چوں نباشد عشق را پروائے او
او چو مرغے ماند بے پر وائے او

اس شعر میں حضرت مولانا نے پھر عشق کی تعریف بیان فرمائی ہے کہ عشق حق تک جانے کیلئے ایک بہترین ذریعہ ہے کہ اسی کی وجہ سے معشوق کو عاشق کی طرف توجہ ہوتی ہے، اگر معشوق کو پرواہ نہ ہو تو یہ صورت ایسے ہے جیسے پروں کے بغیر پرندے کی حالت ہے،اس کی حالت پر افسوس ہے،اگر حضرت حق کو اس کے حال پر توجہ ہو جاتی ہے تو یہ کامیاب ہے اگر حق کو اس کی پرواہ نہ ہو تو بیچارہ محض عاجز ہے ایسے ہی ہے جیسے مرغ پروں کے بغیر ہے جس کی حالت پر بغیر افسوس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

پر و بال ما کمند عشق اوست
مُو کشانش مے کشد تا کوئے دوست

اس شعر میں حضرت مولانا نے اوپر کے شعر کی وضاحت فرمائی ہے فرماتے ہیں جیسے پرندے کو بال و پر کام دیتے ہیں اور اس کی زندگی کا معاملہ اُنہیں بال و پر سے وابستہ ہے ایسے ہی عشق و محبت کی کمند ہمیں کام دے رہی ہے اور یہ عظیم شے کمند ہی ہے جو عاشق کو معشوق کی طرف کھینچتی ہے جیسے پرندہ اپنے بال و پر سے اپنے ٹھکانہ گھونسلہ کی طرف پرواز کرتا ہے ایسے ہی یہ عاشق اس کمند سے اپنے محبوب کی طرف پرواز کرتا ہے۔

من چہ گویم ہوش دارم پیش و پس
چُوں نباشد نور یارم پیش و پس

رب قدوس جل مجدہٗ کے عظیم انعام کا ذکر فرماتے ہیں اگر میرے رب ذوالجلال کا فضل و کرم میری راہنمائی نہ کرے تو مجھے اپنے آگے پیچھے کی کیا خبر رہ سکتی ہے اور میں اپنے ازلی دشمن شیطان کے مکر و فریب سے کیسے بچ سکتا ہوں، شیطان کی عیاری مکاری سے میرا بچے رہنا یہ محض اس کا کرم ہے ورنہ ہر کام میری ہمت سے باہر تھا۔

نہ خلق اس کی خبر لیتی نہ عقل اس کی مدد کرتی
خدا جب تک کسی کا یاور و ناصر نہیں ہوتا

نور او در یُمن و یسر و تحت و فوق
بر سرو بر گردنم مانند طوق

پہلے شعر کی طرح اس میں بھی اپنے پر فضل خداوندی کا ذکر کر کے شکر بجالا رہے ہیں کہ اللہ رب العزۃ کا فضل مجھے گھیرے ہوئے ہے، میرے دائیں بائیں اوپر نیچے میری گردن پر طوق کی طرح حاوی ہے۔ حضرت مولانا کا یہ عنوان حضور ﷺ کی زبان پاک سے اس طرح ملتا ہے آپ نے دعا فرمائی اے میرے رب میرے اوپر نیچے دائیں بائیں نور ہی نور کر دے۔ اگر چشم بصیرت کھلی ہے تو جس طرف دیکھیں اُسی کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔

عشق خواہد کایں سخن بیروں روَد
آئینہ ات غماز نبود چوں بود ؟

حضرت مولانا اس شعر میں فرماتے ہیں عشق تو چاہتا ہے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ راز نہ رہے بلکہ اسے کھلا کھلا واشگاف لفظوں میں بیان کر دیا جائے مگر اس راز کو جاننے کیلئے یہ تو ضروری ہے کہ دل ایسا موجود ہو جو اس راز کے وزن کا متحمل تو ہو سکے اگر کسی سامع میں یہ طاقت ہی نہیں تو اسے کیسے بیان کیا جا سکتا ہے، عشق کے مضامین تو بے شمار ہیں، قرآن مقدس سے واضح اشارہ ملتا ہے اگر اُن کلمات ربی کو لکھنے کیلئے سمندر سیاہی بن جائے تو سیاہی ختم ہو جائے گی مگر کلمات ختم نہیں ہوں گے۔ جب تک سننے والے کا دل روشن نہ ہو تو اس پر اسرار کیسے کھل سکتے ہیں۔

آئینہ ات دانی چرا غماز نیست
زانکہ زنگار از رُخش ممتاز نیست

اس شعر میں مولانا مخاطب، سامع کو جھنجھوڑ رہے ہیں کہ تجھے پتہ ہے کہ تجھ پر عشق و محبت اور وحدت الوجود کے اسرار کیوں نہیں کھل رہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تیرے دل پر غفلت لاپرواہی کا زنگار چھا چکا ہے جو اُن حقائق کو اپنے اندر منکشف ہی نہیں ہونے دیتا، جب تک وہ جما ہوا میل گناہوں کی غلاظت سے دل صاف نہیں ہو گا، اسرار معرفت کیسے کھل سکیں گے۔

آئینہ کز زنگ و الائش جدا ست
پُر شعاع نور خورشید خداست

اس سے پہلے شعر میں تھا کہ عشق و محبت کے اسرار بندے پر کیوں نہیں کھلتے اس لئے کہ اس کا سینہ غفلت و لاپرواہی کے انگارے بھر گیا ہے، اس شعر میں دوسری حالت کو بیان فرمایا جا رہا ہے کہ اگر دل غفلت کے زنگ سے صاف ہے تو وہ خورشیدِ خدا کے نور سے جگمگا رہا ہے۔ گویا پہلے شعر میں گندلے آئینہ کا ذکر تھا اس شعر میں روشن و منور دل کا ذکر فرمایا گیا ہے جو آئینۂ دل گناہوں کی کدورت، اعمال کی برائی سے محفوظ ہے وہ دل نور خدا سے منور ہے وہ دل عشق و محبت کے اسرار سے بہرہ ور ہے۔

رَو تو زنگار از رُخ او پاک کن
بعد ازاں آن نور را ادراک کن

اس شعر میں سالک سے فرمایا جارہا ہے، اے طالب اگر تو چاہتا ہے کہ اسرارالٰہیہ سے نوازا جائے تو پہلے اپنے آئینہ دل کے چہرے کو ماسوی اللہ کی آلائشوں، گناہوں کے زنگار سے پاک کر اپنے دل کو اسرارالٰہیہ کا مرکز بنانے کیلئے بہت ضروری ہے کہ اُسے غیراللہ کے تعلقات سے الگ کیا جائے اگر دل کی یہ صورت ہوگئی تو پھر ہر سمت اسے حسن و جمال کا مظاہرہ ہوتا رہے گا۔

ایں حقیقت را شنو از گوش دل
تا بروں آئی بکلی زاب و گل

پہلے شعر کا مفہوم ہی اس شعر میں دہرایا جارہا ہے فرماتے ہیں میں نے جو صحیح بات کہہ دی ہے اسے غور سے سن دل کے کان کھول کر سن تا کہ تو جسم و جسمانیات کے جھگڑوں سے نجات حاصل کرے، پہلے شعر کی بات کو ہی دہرا رہے ہیں کہ یہ میری سچی بات کو کہیں ضائع نہ کر دینا اگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا اور پرواہ نہ کی تو پھر عالم قدس کی سیر تیرے حصہ میں نہیں آسکتی۔

فہم گر دارید جاں را رہ دہید
بعد ازاں از شوق پادر رہ نہید

اس شعر میں مولانا سالک کو توجہ دلا رہے ہیں کہ اگر تیرے اندر عقل و فکر ہے تو اپنی روحانی ترقی کیلئے اپنی روح کو کامیابی کی طرف مائل کر جب تیرے اندر یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ تو نے اپنی روح کو صحیح راہ پر لانے کا بندوبست کر لیا ہے تو پھر بلا جھجک اُسی راہ پر چلتا رہ، کامیابی نصیب ہوگی مولانا فرمار ہے ہیں اگر اپنی بہتری کا

خیال رکھتے ہو تو اپنی روح کو گرنے سے بچاؤ اور اُسے بلندی کی طرف لے جاؤ، پھر تیری کامیابی کی راہیں واہوں گی۔

بود شاہے او زمانے پیش ازیں
ملک نیا بودش و ہم ملک دیں

اس شعر میں مولانا ایک بادشاہ کے عشق کا ذکر کرتے ہیں جو کنیز پر عاشق ہو گیا تھا اور اس نے کئی معالجوں اور طبیبوں سے علاج کرایا مگر نا کام رہا اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے مولانا ہماری حالت کو اس حکایت پر منطبق کر رہے ہیں جس طرح ایک بادشاہ ایک کنیز پر عاشق ہو گیا تھا اسی طرح روح بادشاہ ہے جو نفس کا مطیع ہو گیا، اُسی کا عاشق بن گیا جیسے بادشاہ نے ناقص طبیبوں سے رابطہ کیا مگر فائدہ نہ ہوا اسی طرح بیمار روح کو ناقص مشائخ سے بھی فائدہ نہیں ہوتا۔

اسی طرح جب شیخ کامل دنیوی لذات سے نفس کو جدا کر دیتا ہے اور نفس ان مہلک بیماریوں سے نجات پالیتا ہے تو پھر روح اپنی پرواز میں کامیاب ہو جاتی ہے، مولانا بھی فرماتے ہیں اگر دل سے زنگار صاف کرنا چاہتے ہو تو شیخ کامل سے رجوع کرو وہ تمہاری شرعی اصول وضوابط کے مطابق اصلاح کر دے گا۔ دراصل اس قصے کا تعلق اوپر کے اس شعر سے ہے

روتو زنگار از رخ او پاک کن

اسرار عشق کو سمجھنے کیلئے دل کو زنگار سے پاک کرنا ضروری ہے، بادشاہ کے طویل قصہ کا خلاصہ یہ ہے یہ بادشاہ لونڈی پر فریفتہ ہو گیا، اس لونڈی کا تعلق کسی اور

علاقہ سے تھا، بادشاہ نے بہت علاج معالجے کئے مگر شفا نہ ہوئی، مایوس ہوکر خدا کی طرف رجوع کیا تو ایک غیبی طبیب نے مشورہ دیا اور مختلف دواؤں سے لونڈی کے معشوق کو بدصورت کردیا اب یہ لونڈی اس سے متنفر ہوگئی، بادشاہ کی مراد پوری ہوگئی، مولانا یہی نتیجہ دیتے ہیں کہ روح بادشاہ ہے جو نفس پر عاشق ہے اور نفس لذات دنیا پر فریفتہ ہے عالم معالج اس کے علاج سے محروم ہیں، شیخ کامل ہی ہے جو اپنی تربیت سے نفس کی نظر میں دنیا کو بدصورت بنادے گا پھر نفس روح کے تابع ہوجائے گا یہی کامیابی کی راہ ہے۔ حضرت مولانا نے اس شعر بشنوید اے دوستاں میں فرمایا ہے، دوستو یہ قصہ سنو کہ وہ ہماری موجودہ حالت کا صحیح عکس ہے۔

بشنوید اے دوستاں ایں داستاں
خود حقیقت نقدِ حالِ ماست آں

اس شعر میں مولانا فرماتے ہیں دوستو! یہ قصہ سنو وہ ہماری حالت کا صحیح عکس ہے فرماتے ہیں بادشاہ کے قصہ پرغور چاہئے کہ وہ کس قدر پریشان رہا جب اُسے غیبی طبیب کی طرف سے حل بتایا گیا تو وہ کامیاب ہوگیا، تجھے بھی اپنی روحانی بیماری کے علاج کیلئے کسی طبیب کامل کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ کمزور و ناقص مشائخ یہ ہمت نہیں رکھتے کہ روح کو نفس کے داؤ پیچ سے آزاد کر کے اُسے اپنا اصلی وطن اور باغ و بہار دکھادیں، اس عظیم کام کیلئے شیخ کامل کی ضرورت ہے اس سے پہلے شعر میں حضور ﷺ کے زمانہ سے پہلے کے ایک بادشاہ کا ذکر کیا جو دنیا کا بادشاہ بھی تھا اور اپنے اچھے کاموں کی وجہ سے دین کا بھی۔

اتفاقا شاہ روزے شد سوار
با خواص خویش از بہرِ شکار

اتفاق سے ایک دن بادشاہ اپنے خاص دوستوں سمیت شکار کی غرض سے سوار ہوا۔

یک کنیزک دید او بر شاہراہ
شد غلام آں کنیزک جانِ شاہ

بادشاہ نے اس سفر کے دوران راستہ میں ایک (لونڈی) دیکھی جس پر وہ بادشاہ عاشق ہوگیا بادشاہ کی جان اس لونڈی کی غلام ہوگئی۔

مرغ جانش در قفس چوں در طپید
داد مال و آں کنیزک را خرید

چونکہ اس کا طائر جان جسم کے پنجرے میں عشق کے باعث جل رہا تھا اس لئے اس نے رقم دے کر لونڈی کو خرید لیا۔

چُوں خرید او را او بر خور دار شد
آں کنیزک از قضا بیمار شد

جب اس نے لونڈی کو خرید لیا اور کامیاب ہوگیا تو قدرتی طور پر وہ لونڈی بیمار ہوگئی۔

آن یکے خرداشت وپالانش نبود
یافت پالاں گرگ خر را در ربود

مولانا فرماتے ہیں اسے ایسے سمجھا جائے ایک شخص کے پاس گدھا تو تھا مگر

اس کے پاس اس کا پالان نہ تھا پھر جب پالان ملا تو گدھے کو بھیڑیا لے گیا۔

کوزہ بودش آب مے نامد بدست

آب را چوں یافت خود کوزہ شکست

پہلے شعر کی طرح اس میں بھی ایک مثال بیان کی ہے کہ ایک شخص کے پاس کوزہ تو تھا مگر پانی نہ تھا اور جب پانی ملا تو کوزہ ٹوٹ گیا، اوپر کے ان دونوں شعروں کا مطلب کچھ اس طرح ہے کہ اکثر لوگوں کو ایک شے میسر ہے تو دوسری نہیں جب دوسری شے ملتی ہے تو پہلی نہیں ہوتی، یہی حال اس بادشاہ کا تھا کہ کنیز نہ تھی مگر جب وہ کنیز مل گئی تو بیماری کے سبب وصل کا موقعہ ہاتھ سے جاتا رہا۔

شاہ طبیباں جمع کرد از چپ و راست

گفت جان ہر دو در دست شما ست

بادشاہ نے دائیں بائیں سے بہت سے طبیب بلا لئے اور اُنہیں کہا میری اور لونڈی کی زندگی تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ اگر لونڈی کا علاج نہ ہوا تو وہ مر جائے گی اور میری جان بھی تمہارے ہاتھ میں ہے اگر وہ مر گئی تو میں اس کا شیدا ہوں میں بھی مر جاؤں گا، معشوق کی سلامتی عاشق کی سلامتی ہے۔

جان من سہل است و جان جانم اوست

درد مندہ و خستہ ام در مانم اوست

بادشاہ کہتا ہے میری جان کا تو کوئی مسئلہ نہیں یہ تو معمولی چیز ہے میری جان

کی جان تو وہی لونڈی ہے، میں مرض عشق سے زخمی ہوں میرا علاج وہی ہے۔ پہلے شعر میں اشارہ تھا کہ عاشق اپنی ہستی کو معشوق کے سامنے شمار نہیں کرتا۔

ہر کہ درماں کرد مر جان مرا
برد گنج دُرّ و مرجانِ مرا

اس شعر میں مولانا لونڈی کے علاج کرنے والوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں جس نے میری جان (لونڈی) کو صحت مند کر دیا وہ میرے خزانے کے سارے موتی ہیرے جواہر لینے کا حقدار ہو گیا، بادشاہ کے اس اعلان پر لونڈی کا علاج کرنے والے تمام طبیبوں نے کہا

جملہ گفتندش کہ جانبازی کنیم
فہم گردِ آریم و انبازی کنیم

تمام طبیبوں نے اکٹھے ہو کر بادشاہ کو جواب دیا، بادشاہ سلامت آپ پریشان نہ ہوں ہم سارے مل بیٹھ کر سوچ سمجھ کر علاج کریں گے آپ کی لونڈی کی صحت پر اپنی جان لڑا دیں گے، ساتھ ہی طبیبوں نے کہا

ہر یکے از ما مسیح عالمے ست
ہر الم را در کف ما مرہمے ست

اے بادشاہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہم میں سے ہر حکیم دنیا بھر کا مسیح ہے، کامیاب معالج ہے اور ہم میں ہر ایک کے پاس ہر درد کا مرہم موجود ہے۔

گر خدا خواہد نہ گفتند از بطر
پس خدا بنمود شاں عجزِ بشر

پچھلے شعر میں حکیموں کے ایک اعلان کا ذکر تھا کہ انہوں نے کہا ہم سارے ماہر طبیب ہیں اس لونڈی کا علاج کریں گے، مگر ان طبیبوں نے اپنے دعوی علاج کے ساتھ ان شاء اللہ نہ کہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی کمزوری دکھا دی۔ بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ بار بار اس کی تفصیل پوچھتے رہے آخر میں کہا ہم ان شاء اللہ گائے کا پتہ لگالیں گے، حضور ﷺ نے فرمایا اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو انہیں اس قسم کی گائے کا کبھی پتہ نہ چلتا۔

ترک استثنا مرادم قسوتے ست
نَے ہمیں گفتن کہ عارض حالتے ست

مولانا اس شعر میں ان شاء اللہ نہ کہنے پر تبصرہ فرمارہے ہیں، فرماتے ہیں ان شاء اللہ نہ کہنا بھی سیاہ دلی ہے، زبان سے کہا اور دل کا ساتھ نہ دینا بھی سیاہ دلی ہے، مولانا کا مفہوم یہ ہے کہ استثناء یعنی ان شاء اللہ صرف زبانی نہ ہو بلکہ دل بھی اس کا ساتھ دے اگر دل ساتھ نہ دے تو وہ بھی سیاہ دلی ہے۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کا وہ ارشاد گرامی سامنے رہنا چاہئے اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے۔ اسی عنوان پر ایک اور حدیث شریف اس طرح ملتی ہے حضور ﷺ نے فرمایا آخری زمانے میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو دین کے ذریعہ دنیا کماتے پھریں گے، ان کی زبانیں میٹھی ہوں گے مگر ان کے دل بھیڑیوں کے

دلوں کے سے ہوں گے۔

اے بسا ناوردہ استثنا بگفت

جان اُو با جانِ استثنا ست جُفت

اس شعر میں مولانا ایک ایسے طبقہ کا ذکر کرتے ہیں جو زبان سے استثناء (ان شاءاللہ) کا ذکر تو نہیں کرتے مگر ان کے دل اس کی حقیقت سے بھرپور ہوتے ہیں اللہ والوں کا ذکر فرماتے ہیں اگر یہ لوگ زبان سے ذکر تسبیح، اللہ اللہ کے کلمات نہ کہیں تو بھی ان کے دل یادالٰہی میں مصروف ہوتے ہیں۔

ہر چہ کردند از علاج و از دوا

گشت رنج افزوں و حاجت ناروا

اس شعر میں مولانا نے فرمایا ان طبیبوں کے دعوؤں کے باوجود اس لونڈی کی بیماری بڑھ گئی اور ان کا علاج ناکام رہا۔ ان کے علاج کے باوجود مرض میں اضافہ ہوا،

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آں کنیز از مرض او چوں مُوئے شد

چشم شاہ از اشک خون چو جوئے شد

فرماتے ہیں وہ لونڈی اپنی اس بیماری سے یہاں تک کمزور ہوگئی کہ بال کی سی بن گئی اور بادشاہ کی یہ حالت ہوگئی کہ اس کی آنکھوں سے نہر کی طرح پانی جاری ہو گیا، بادشاہ کی آہ وپکار بڑھ گئی۔

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود
آن دوا در نفع خود گمرہ شود

فرماتے ہیں جب بیمار کی قضا آتی ہے تو طبیب کو کچھ سمجھ نہیں آتا وہ نسخہ تجویز کرنے میں غلطی کر جاتا ہے نسخہ کچھ تجویز کرنا ہوتا ہے کر کچھ جاتا ہے، اگر نسخہ مفید بھی ہو تو نتیجہ اُلٹا نکلتا ہے۔

از قضا سر کنگبیں صفرا فزود
روغن بادام خشکی مے نمود

طبیبوں کے علاج کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں علاج کچھ کرتے ہیں نتیجہ کچھ ہوتا ہے ہر دوا مخالف پڑتی ہے نتیجہ کچھ کا کچھ نکلتا ہے۔ایسے ہی سمجھا جائے جیسے سکنجبین کے استعمال سے صفرا زیادہ ہو جائے یا روغن بادام سے خشکی بڑھ جائے۔

از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت
آب آتش را مدد شد ہمچو نفت

فرماتے ہیں یہ ایسے ہی ہو گیا جیسے ہلیلہ قبض کشا دوائی ہے مگر اس سے قبض ہو گئی اور پانی جو ٹھنڈی شے ہے مٹی کے تیل کی طرح بخار کی مدد بن گیا یعنی بیماری کے آگے دوائی کی کچھ پیش رفت نہ ہوئی ہر کوشش کا اُلٹا اثر ہوا۔

سستی دل شد فزوں و خواب کم
سوزش چشم و دل پُر درد و غم

طبیبوں کے ماہرانہ علاج کا اثر یہ ہوا کہ دل کی سستی بڑھ گئی اور نیند گھٹ گئی، دل پر درد کا اثر زیادہ ہوگیا، طبیبوں کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں۔

شربت و ادویہ و اسباب او
از طبیباں بُرد یکسر آبرو

طبیبوں کے سارے دعوے دھرے رہ گئے اُن کی دواؤں، اُن کے طریق علاج نے ان کی عزت برباد کردی، اُن معالجین کی بے بسی نے اُنہیں لوگوں کے سامنے بے آبرو کردیا۔

شہ چوں عجز آں طبیباں را بدید
پا برہنہ جانب مسجد و روید

بادشاہ نے جب طبیبوں کی ناکامی دیکھ لی تو اس نے اپنی توجہ اپنے رب قدوس کی جانب پھیرلی تو ننگے پاؤں مسجد شریف کی طرف دوڑا، اللہ والوں کا یہی کام ہوتا ہے کسی بھی مشکل مرحلہ میں مبتلا ہوں تو نگاہیں اپنے معبود حقیقی پر ہی جماتے ہیں۔

رفت در مسجد سوئے محراب شد
سجدہ گاہ از اشک شاہ پُر آب شد

اس شعر میں مولانا بادشاہ کی مسجد کی طرف روانگی اور بے تابی کا ذکر فرما رہے ہیں، وہ مسجد میں پہنچ کر سیدھا محراب شریف کی طرف گیا، اس کی پریشانی اور عجز و انکساری کی حالت یہ تھی کہ وہ سجدہ میں گر کر بارگاہ قدس میں اس قدر رویا کہ اس کے

آنسوؤں سے محراب شریف تر ہو گیا۔

چوں بخویش آمد ز غرقاب فنا
خوش زباں بکشاد در مدح و ثنا

جب بادشاہ اپنے عجز و انکساری، آہ و زاری کے عالم سے فارغ ہو گیا تو اب اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں زبان کھولی اور عرض کی اے میرے ربّ قدوس میں کیا عرض کروں؟ میری جان کو تُو خود بہتر جانتا ہے، اپنے رب ذوالجلال کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

کاے کمینہ بخششت ملک جہاں
من چہ گویم چوں تو میدانی نہاں

اے میرے رب پاک تیرے حضور میں کس طرح بات کروں تو تو چھپے رازوں کو جانتا ہے تیری کرم نوازی کا تو یہ عالم ہے کہ تو جسے چاہے ملک بخش دے۔

حال ما و ایں طبیباں سر بسر
پیش لطف عام تو باشد ہدر

عجز و انکساری کے عالم میں بادشاہ عرض کرتا ہے اے اللہ! ہمارا اور ان طبیبوں کا حال تیرے سامنے ہے ہم نے تیری ذات پر بھروسہ نہ کیا جو تجھ سے دوری کا سبب بن گیا، ہمارا تجھ پر بھروسہ نہ کرنا بے شک یہ برائی ہے مگر تیرے لطف و کرم کے سامنے تو ہماری اس برائی کی کوئی حقیقت نہیں تو کریم ہے رحیم ہے۔

اے ہمیشہ حاجت مارا پناہ
بارِ دیگر ما غلط کردیم راہ

پہلے شعر کے مفہوم کو ہی دوسرے انداز میں بیان کیا جا رہا ہے اے ربّ قدوس تو ہماری ضرورتوں کی پناہ ہے پھر ہم سیدھی راہ سے بھٹک گئے، تجھ علام الغیوب کو حال سنانے لگے، مولانا اس شعر میں دو کوتاہیوں کا ذکر فرما رہے ہیں کہ پہلی غلطی ہم سے یہ ہوئی کہ علاج کے سلسلہ میں طبیبوں پر بھروسہ کیا جو توکل کے خلاف تھا، دوسری غلطی یہ ہوئی کہ تجھ کو حال سنانے لگے حالانکہ تو تو علام الغیوب ہے، ہمیں چاہئے تھا کہ تجھے درخواستیں سنانے کی غلطی نہ کرتے۔

لیک گفتی گرچہ میدان سرت
زود ہم پیدا کنش بر ظاہرت

اس شعر میں حضرت مولانا نے اپنی غلطی کی وجہ بیان کی ہے اے ہمارے معبود! ہم سے یہ غلطی اس لئے سرزد ہوگئی، تو نے خود فرمایا ہے، میرے بندے اگرچہ میں تیرے بھید جانتا ہوں مگر تو خود بھی اپنی حالت کے مطابق بیان کر۔ خلاصہ یہ ہوا غیب کے جاننے والے سے اپنے حال کا ظاہر کرنا غلطی ہے مگر چونکہ وہ خود فرماتا ہے مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، اس لئے عرض کرتا ہوں۔

چوں بر آورد از میان جان خروش
اندر آمد بحرِ بخشایش بجوش

اوپر کے اشعار میں فرمایا گیا، بادشاہ نے مسجد میں جا کر عجز وانکساری سے دعا مانگی، بادشاہ کی دعا کے خلاصہ کا ذکر کیا جا رہا ہے جب اس نے تہہ دل سے اللہ کے حضور التجا کی تو ربّ قدوس کی بخشش کا سمندر جوش میں آ گیا اس کی عجز وانکساری یہ رنگ لے آئی کہ قبولیت کا وقت آ گیا، دعا کی قبولیت کے لئے یہ شرط ہے کہ اخلاص ہو، عجز ہو انکساری ہو اور دل کی گہرائیوں سے ہو۔

درمیان گریہ خوابش در ربود
دید در خواب او کہ پیرے رو نمود

اسی شعر میں مولانا نے بادشاہ کی دعائیہ حالت کا ذکر فرمایا ہے کہ بادشاہ کو اپنی عجز وانکساری کی حالت میں روتے روتے نیند آ گئی اس نے خواب دیکھی کہ ایک بوڑھا سامنے آ گیا اور اس نے کہا اے بادشاہ تجھے خوشخبری ہو تیری ضرورتیں پوری ہو گئیں اگر کل کو کوئی اجنبی آدمی تیرے پاس آئے تو وہ ہماری طرف سے ہو گا۔

چونکہ آید او حکیم حاذق است
صادقش داں کو امین و صادق است

خواب میں آنے والے بوڑھے نے کہا جب وہ آئے تو یقین کر لو وہ کامیاب طبیب ہے اُسے سچا سمجھنا کہ وہ امین ہے اور سچا ہے۔

در علاجش سحر مطلق را ببیں
در مزاجش قدرت حق را ببیں

بادشاہ دیکھ لینا اس کا علاج کس طرح جادو کی طرح اثر کرتا ہے، اس آدمی کے مزاج میں اللہ کی قدرت کا جلوہ دیکھنا۔

خفتہ بود ایں خواب دید آگاہ شد
گشتہ مملوک کنیزک شاہ شد

جب بادشاہ نے یہ خواب دیکھی کہ اُسے خواب میں کسی طبیب حاذق کو دکھایا گیا ہے تو بیدار ہوا تو اس کی حالت یکسر بدل گئی، خواب سے پہلے وہ لونڈی کے غم میں بے بس تھا مجبور تھا اب اس خواب کے بعد وہ بادشاہوں کی طرح خوش تھا آزاد تھا

چوں رسید آں وعدہ گاہ روز شد
آفتاب از شرق اختر سوز شد

جب وعدہ کا وقت پورا ہو گیا اور دن چڑھ گیا، آفتاب مشرق سے طلوع ہو گیا ستارے غائب ہو گئے۔

بود اندر منظرہ شہ منتظر
تا بہ بیند آنچہ بنمودند سرّ

اس شعر میں مولانا نے بادشاہ کی ایک کیفیت کا ذکر کیا ہے کہ بادشاہ اپنے محل کے کونہ میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ جو بھید اس پر کھولا گیا ہے وہ دیکھ بھی لے۔

دید شخصے کاملے پر مایہ
آفتاب درمیان سایہ

بادشاہ اسی انتظار میں تھا کہ اس نے ایک کامل شخص کو دیکھا جو سایہ میں آفتاب تھا، یعنی اندھیرے کا اُجالا تھا، یا یوں کہو کہ آفتاب نمایاں تھا یا یوں کہئے کہ یہ ایک حقیقی آفتاب تھا۔ مولانا کے اس شعر کا ترجمہ یہ بھی اچھا ہے

یہ امانت تھی کہ تو حامل بنا ذات کا آئینہ کامل بنا

میر سید از دور مانند ہلال
نیست و بود ہست بر شکل خیال

اس شعر میں اس شخص کے وجود پر تبصرہ کیا گیا ہے جو بادشاہ نے دیکھا اس بندے کو ہلال کے ساتھ تشبیہ دی گئی، ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ بندہ اپنی ریاضت وعبادت اور مجاہدہ کی وجہ سے انتہائی کمزور ہو رہا تھا دوسری وجہ یہ کہ چاند کی طرح اس کا انتظار تھا یعنی وہ بندہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے نیست تھا اور بقائے حق کے لحاظ سے وہ ہست تھا اس بندے میں یہ دونوں کیفیتیں موجود تھیں کہ وہ فنا فی اللہ کے مقام پر تھا اور بقاء باللہ کی منزل کو بھی طے کر چکا تھا۔

نیست وش باشد خیال اندر جہاں
تو جہانے بر خیالے بیں رواں

فرماتے ہیں جہاں میں خیال بھی ایک نہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے، اگلے مصرعہ میں فرماتے ہیں خیال کی تو کوئی حیثیت نہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ ساری دنیا بھی خیال کی رفتار پر چل رہی ہے تو درست ہے۔

بر خیالے صلح شان و جنگ شان
وز خیالے فخر شان و ننگ شان

پہلے شعر میں تھا کہ جہاں میں خیال بھی ایک نہ ہونے کی حیثیت سے ہے، اس میں اسی عنوان کو دوسرے رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ دنیا میں آپس کی لڑائیاں، جھگڑے، دشمنی کسی نہ کسی خیال ہی پر موقوف ہوتے ہیں، کامیابی ہو تو خیال ہی کی بدولت ہوتی ہے، ناکامی ہو تو بھی خیال ہی کی نسبت سے ہوتی ہے یہ خیال ہی ہے جس سے فخر کی بلندی ہے اور خیال ہی ہے جس سے شرمندگی ملتی ہے۔

آں خیالاتے کہ دام اولیاست
عکس مہ رویان بستان خداست

پہلے دو شعروں میں ذکر تھا کہ خیالات کی کوئی حیثیت نہیں یہ بے بنیاد سی شے ہیں، اب انہیں خیالات کے عنوان کو دوسرے رنگ میں پیش فرما رہے ہیں کہ اولیاء اللہ کے خیالات کا یہ حال نہیں کہ وہ بے معنی سے ہوں، اُن کے خیالات ٹھیک ہیں اور حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں، اولیاء اللہ کے خیالات جیسے بڑھتے ہیں، ترقی کرتے ہیں، اولیاء اللہ کی ہمت قوت اور بارگاہ قدس میں محبت کو فروغ ملتا ہے ان کے خیالات خدا پناہ وہمی یا فرضی نہیں بلکہ وہ قدرت کے باغ علم سے حسن و جمال لیتے ہیں اسی نسبت سے ان کو ماہ رو یعنی حسین کہا گیا ہے۔ ان کے خیالات علوم الٰہیہ سے ہوتے ہیں، جاہلوں اور دنیا داروں کے خیالات کی طرح نہیں۔

آں خیالے را کہ شہ در خواب دید
در رُخ مہماں ہمے آمد پدید

بادشاہ نے جو خیالات خواب میں دیکھے تھے وہ مہمان کے چہرے پر نمایاں تھے، یہ بادشاہ بھی اہل اللہ سے تھا اس کے خیالات بھی حقیقت پر مبنی تھے، خواب میں اس پیر نے جو آنے والے مہمان کے اوصاف بیان کیے تھے وہ ٹھیک اس مہمان کے چہرے پر دیکھ لئے۔

نور حق ظاہر بود اند ولی
نیک بین باشی اگر اہل دلی

مولانا فرماتے ہیں جو شخص فنا کے مقام سے گذر کر بقا کی منزل تک پہنچ گیا ہے اس شخص میں اللہ کا نور جلوہ فرما ہوتا ہے، فرماتے ہیں اگر تو دل کی روشنی رکھتا ہے تو خوب پہچان لے۔ فرماتے ہیں بادشاہ کو مہمان کا پہچاننا کوئی مشکل مسئلہ نہ تھا کیونکہ اہل دل ولی کو اس کی غیبی علامات سے اچھی طرح جان لیتے ہیں مگر اس کا ادراک اہل دل کو ہوتا ہے، وہ انوار یہ ہیں کہ اس کی محفل سے اللہ کی محبت ملتی ہے، دنیا سے نفرت ہوتی ہے۔

آن ولی حق چو پیدا شد زدور
از سرا پائش ہمے میر بخت نور

مولانا فرماتے ہیں جب وہ ولی دور سے ظاہر ہوا گویا اس کے سر سے پاؤں تک نور برستا تھا۔

شہ بجائے حاجباں در پیش رفت
پیش آن مہمان غیب خویش رفت

اس شعر میں بادشاہ کی اس حالت کا ذکر کیا گیا ہے جس حالت میں غیبی مہمان کے سامنے گیا، یہ ایک عجیب کیفیت تھی کہ بادشاہ اپنی بادشاہی کے باوجود ایک فقیر کے سامنے سراپا عجز و نیاز ہے۔

ضیف غیبی را چوں استقبال کرد
چوں شکر گوئی کہ پیوست او بورد

اس شعر میں مولانا نے بادشاہ کا غیبی مہمان کے استقبال کا منظر پیش کیا ہے فرماتے ہیں جب غیبی مہمان کا استقبال کیا تو اس میں پیار و محبت کا یہ عالم تھا وہ لپٹنا ایسا تھا جیسے شکر کی طرح گلاب کے پھول سے گھل مل گیا، اس استقبال کا اتصال ایسے تھا جیسے گلقند میں شکر اور گلاب کے پھول ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں، اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ بادشاہ بھی کمال باطنی سے خالی نہ تھا۔

ہر دو بحری آشنا آموختہ
ہر دو جاں بیدوختن بردوختہ

اسی استقبال کا اظہار ہے کہ یہ دونوں، بادشاہ اور مہمان سمندری تیرنا سیکھے ہوئے تھے یعنی دریائے معرفت کے نشیب و فراز سے آگاہ تھے۔ یعنی دونوں جانیں بغیر سلائی کے ایک دوسرے سے سلی ہوئی تھیں، یعنی دونوں کی روحیں ایسی ملی ہوئی تھیں

جیسے باہم سلی ہوتی ہیں۔ یہ مضمون زیادہ واضح ہے کہ یہ دونوں عارف باللہ تھے۔

آں یکے لب تشنہ واں دیگر چو آب
واں یکے مخمور و آں دیگر شراب

اب دونوں کے ملنے کو دوسری تشبیہ سے بیان کیا جارہا ہے یعنی بادشاہ پیاسے کی طرح تھا اور مہمان پانی کی طرح یعنی بادشاہ پیاسے کی طرح تڑپ رہا تھا اور دوسرا پانی کی طرح سیراب کرنے والا تھا۔

گفت معشوقم تو بود ستی نہ آں
لیک کار از کار خیزد در جہاں

بادشاہ نے مہمان سے کہا درحقیقت میرا محبوب تو تو ہی تھا وہ کنیز نہ تھی مگر یہ ایک سبب بن گیا جیسے دنیا میں ایک کام دوسرے کا سبب بنتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے کنیز کے عشق کو تیری زیارت کا سبب بنا دیا، صحیح صورت یہی ہے کہ مقصود آپ ہی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کنیز کے عشق کو آپ کی زیارت کا سبب بنا دیا۔ مسجد میں آنا دعا میں مصروف ہونا دعا کی قبولیت آپ کی تشریف آوری لونڈی کی شفا کا سبب بن گئی۔

اے مرا تو مصطفےٰ من چوں عمر
از برائے خدمتت بندم کمر

اس شعر میں مولانا نے حضور ﷺ سے تشبیہ دی ہے معنی یہ ہے کہ جیسے حضور ﷺ مخدوم ہیں اور عمر فاروق خادم ہے ایسے ہی آپ مخدوم ہیں اور میں خادم ہوں۔

اس شعر میں اہل اللہ کی خدمت محبت کی فضیلت محسوس ہوتی ہے یہاں پر یہ شبہ صحیح نہیں ہوگا کہ یہ قصہ تو پہلی امتوں میں سے ہے اُنہیں حضور علیہ السلام اور عمر فاروق کی کیسے خبر ہوگئی تو جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ مولانا نے شاعرانہ تمثیل کے طور پر حضور ﷺ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ذکر کر دیا۔

درخواستن توفیق رعایت ادب وخامت بے ادبی

رعایت ادب کی توفیق کی خواہش اور بے ادبی کی مذمت

از خدا جوئیم توفیق ادب
بے ادب محروم ماند از فضل رب

پچھلے اشعار میں بادشاہ اور مہمان کے تعلقات واقعات کا ذکر تھا، بادشاہ نے مہمان کو ادب واحترام سے بلایا اور قرب حاصل کیا، اس شعر میں مولانا فرماتے ہیں ہم رب قدوس سے ادب کی توفیق چاہتے ہیں بے ادب اللہ کے انعام، فضل وکرم سے محروم ہے۔اسی عنوان پر مشہور تکیہ کلام یہ ملتا ہے

با ادب بانصیب بے ادب بے نصیب

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد
بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

مولانا بے ادبی کی برائی کا ذکر فرما رہے ہیں کہ بے ادب صرف اپنے آپ کو ہی برباد نہیں کرتا بلکہ کائنات میں فتنہ وفساد کی آگ لگا دیتا ہے اس کی بے ادبی سے

دوسروں کو بھی نقصان پہنچتا ہے بلکہ جانوروں پرندوں تک اس میں مبتلا ہوں گے جیسے کسی نے اچھا کہا

شنیدم کہ ہر مرغ و مور دواں شود تنگ روزی ز فصل بداں

میں نے سنا ہے بروں کی بدعملی کی وجہ سے جانوروں پر بھی روزی تنگ ہوتی ہے، یہ عنوان حدیث شریف سے اس طرح ملتا ہے فرمایا جب کسی قوم میں کوئی آدمی گناہ کرتا ہے اور لوگ اسے منع کر سکتے ہوں اور نہ کریں تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے لوگوں کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے (مشکوٰۃ شریف)

مائدہ از آسماں در می رسید
بے شر او بیع و بے گفت و شنید

اس شعر میں مولانا نے بنی اسرائیل پر ایک عظیم انعام خداوندی کا ذکر کیا ہے کہ انہیں آسمان سے من وسلویٰ بلا مشقت مل جاتا تھا نہ خرید وفروخت کرنا پڑتا تھا نہ کسی محنت و پریشانی میں مبتلا ہونا پڑتا تھا۔ ''من'' ترنجبین کو کہتے ہیں اور ''سلویٰ'' پرندہ ہے

درمیان قوم موسیٰ چند کس
بے ادب گفتند کو سیر و عدس

حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے بنی اسرائیل پر من وسلویٰ کے انعام اور اس آسمانی دسترخوان کی نعمت کا ذکر فرما کر قوم بنی اسرائیل کی نااہلی کو بیان فرمایا ہے کہ قوم سے چند گستاخ لوگوں نے پھر بھی یہ کہہ دیا کہ اس دسترخوان میں لہسن اور مسور کی دال کہاں ہے؟ یعنی وہ لوگ نعمت خداوندی کا شکر بجالانے کے بدلے بے ادبی کے ساتھ

لہسن اور مسور کا مطالبہ کرنے لگے۔ ان کی اس ناشکری کی سزا انہیں اس طرح ملی۔

منقطع شد خوان و نان از آسمان
ماند رنج زرع و بیل و داسمان

بنی اسرائیل کو اس ناشکری کا جواب اس طرح دیا گیا کہ کھانا آسمان سے آنا بند کر دیا گیا اور قوم کے مقدر میں آخر کار کھیتی باڑی کرنا اور درانتی چلانا رہ گیا، ان گستاخ لوگوں کے جواب میں حکم دیا گیا ''اھبطو مصرا فان لکم ما سالتم'' کسی بستی میں چلے جاؤ جو مانگتے ہو مل جائے گا ان کی ناشکری کی سزا انہیں اس طرح ملی کہ آخر کار کھیتی باڑی کرنے کی مشقت میں مبتلا کیا گیا، قرآن مقدس نے اس عنوان کو اس طرح بیان کیا ہے اگر نعمتوں پر شکر ادا کرو گے تو انعامات بڑھا دوں گا اگر انکار ناشکری کرو گے تو میری گرفت سخت ہے۔

باز عیسیٰ چوں شفاعت کرد حق
خوان فرستادو غنیمت بر طبق

بنی اسرائیل کی ناشکری اور اس کی سزا کے ذکر کے بعد مولانا علیہ الرحمہ نے عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے مطالبہ کا ذکر کیا جب قوم نے عیسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمارے لئے آسمان سے نعمتوں کا خوان اُترے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی جس کا ذکر قرآن مقدس نے اس طرح کیا

''ربنا انزل علینا مائدۃ''

اے اللہ ہم پر دستر خوان اُتار۔

عیسیٰ علیہ السلام کی یہ درخواست قبول ہوئی اوران پر خوانچہ اترنا شروع ہوگیا جس میں بھنا ہوا گوشت، روٹیاں، مچھلی، سرکہ شہد تک تھا۔

مائدہ از آسمان شد عائدہ
چونکہ گفت انزل علینا مائدہ

عیسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور خوان اترنا شروع ہوگیا۔

باز گستاخاں ادب بگذاشتند
چوں گدایاں زلّہا برداشتند

اس دسترخوان کے اترنے پر حکم تھا کہ جو کھانا بچے فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا جائے مگر انہوں نے اس پر عمل نہ کیا اور بھکاریوں کی طرح بچا ہوا رکھ لیا، حکم تو تھا کہ بچا ہوا تقسیم کردیں مگر ایسا نہ کیا گیا، زائد مال خرچ کرنے کی فضیلت میں ایک حدیث شریف اس طرح ملتی ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں اے ابن آدم! تیری ضرورت سے زیادہ مال خرچ کرنا تیرے لئے اچھا ہے اور اسے بند رکھنا تیرے لئے برا ہے اور بقدر ضرورت رکھنے میں حرج نہیں۔

کرد عیسیٰ لا بہ ایشاں را کہ ایں
دائم ست کم نگرد از میں

قوم کو عیسیٰ علیہ السلام نے نہایت محبت سے کہا، یہ خوان ہمیشہ کیلئے ہے اور زمین سے کم نہ ہوگا آپ نے قوم کو سمجھایا کہ بچا ہوا ذخیرہ نہ رکھو بلکہ اللہ کی راہ میں

خیرات کرو جب یہ دستر خوان ہمیشہ کیلئے کھلا رہے گا تو بچا رکھنے کا فائدہ کیا؟ آپ نے قوم کو سمجھایا کہ رزق دینا اللہ نے اپنے کرم سے ذمہ لے رکھا ہے، اسی عنوان کو قرآن مقدس نے اس طرح فرمایا کہ ''ہر جاندار کا رزق اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہوا ہے اور وہ کسی پر بھی روزی کو بند نہیں کرتا کوئی اُسے مانتا ہے یا نہیں۔

بد گمانی کردن و حرص آوری
کفر باشد پیش خوان مہتری

آپ نے قوم سے فرمایا اللہ تعالیٰ کے خوان پر بری نیت کرنا اور حرص سے پیش آنا یہ ناشکری ہے اس سے بچو، یہاں کفر سے مراد یا تو کفران نعمت مراد ہے یا پھر ایمان کے خلاف کفر مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد نہ کرنا کفر ہے، ان کا مال کو ذخیرہ کر کے رکھنا ان کی بے اعتمادی تھی۔

زاں گدا رویان نا دیدہ ز آز
آں در رحمت بر ایشاں شد فراز

قوم نے جب عیسیٰ علیہ السلام کی باتوں پر اثر نہ کیا اور اللہ کے کرم پر بے اعتمادی کی، ناشکری کے مرتکب ہو گئے تو نتیجہ یہ نکلا کہ ان حرص کے بھوکوں پر رحمت کا دروازہ بند ہو گیا۔

من و سلویٰ زآسماں شد منقطع
بعد زاں زاں خواں نشد کس منقطع

نتیجہ یہ ہوا کہ انعاماتِ الٰہیہ کا آسمان سے آنا بند ہو گیا چند لوگوں کی ناشکری بے ادبی کا یہ اثر ہوا کہ عام لوگ بھی اس نعمتِ الٰہیہ سے محروم ہو گئے۔

ابر ناید از پئے منع زکوٰۃ
وز زنا اُفتد بلا اندر جہات

اس شعر میں فرمایا جا رہا ہے کہ برائیوں کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے فرماتے ہیں زکوٰۃ روک رکھنے سے بارش بند ہو جاتی ہے بارش کے رکنے سے بے شمار لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کسی نے روکی ہے مشکلات کا سامنا دوسرے بھی کر رہے ہیں ایسے ہی زنا کی برائی سے مشکلات پھیل جاتی ہیں کسی کی برائی سے متاثر دوسرے بھی ہو جاتے ہیں یہ عنوان مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث پاک سے اس طرح ملتا ہے۔ حضرت عمر بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب کسی قوم میں زنا ہونے لگتا ہے تو لوگ قحط میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جب کسی قوم میں رشوت عام ہو جائے تو وہ خوف میں گرفتار کئے جاتے ہیں، زکوٰۃ کے روکنے اور زنا کے عمل سے مراد عام گناہ بھی لئے جا سکتے ہیں۔

ہر چہ آید تو از ظلمات غم
آں زبیاکی و گستاخی ہم

فرماتے ہیں: تجھ پر جو مشکلات و مصائب آتی ہیں وہ کسی نہ کسی تیری نااہلی اور گستاخی کے سبب ہی ہوتی ہے۔ حضرت مولانا کا یہ شعر قرآن مقدس کی اس آیہ کی تفسیر ہے، ''ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم'' تم پر جو مصیبت مشکل

وارد ہوتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب ہے،اس پر یہ اعتراض غلط ہوگا کہ اگر مشکلات اپنے برے کاموں کی وجہ سے آتی ہیں تو انبیاء علیہم السلام جو معصوم ہیں ان پر مشکلات کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے انبیاء علیہم السلام پر مصائب محض ظاہری طور پر ہوتی ہیں حقیقت میں وہ مشکلات ان پر راحت ورحمت ہوتی ہیں کہ ان پر روحانی رنگ کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ اس قسم کی تکلیف سے راحت محسوس کرتے ہیں چونکہ انبیاء علیہم السلام تسلیم ورضا کی سلطنت کے تاجدار ہوتے ہیں،اس لئے اپنے محبوب حقیقی کے ہر قسم کے سلوک کو عین راحت وخوشی محسوس کرتے ہیں۔

ہر کہ بے باکی کند در راہِ دوست
رہزنِ مرداں شد و نامرد اوست

اس شعر میں حضرت مولانا نے ایک ایسے طبقہ کا ذکر کیا ہے جو دوست کی راہ میں لاپرواہی کرتا ہے اس کے متعلق فرماتے ہیں ایسا شخص ڈاکو ہے، مرد مومن نہیں۔ دوست کی راہ سے مراد احکام خداوندی ہیں، ان کی پرواہ نہ کرنا یہ دوست کی مخالفت ہے بغاوت ہے، ایسا شخص نااہل ہے یہ دوسروں کیلئے بھی نقصان کا سبب بنتا ہے، یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ یہ بندہ صوفی تو ہے نہیں، سلوک کو جانتا نہیں، درویشی کا اہل قطعی نہیں مگر اپنے کو اہل اللہ، بزرگ ثابت کر کے لوگوں کو بہکا رہا ہے اس کا یہ عمل مردوں کیلئے ڈاکہ ہے اور صوفیاء کے مشن سے کھلی بغاوت ہے اس کا ایسا کرنا سلوک کی راہ کو بدنام کرتا ہے۔

از ادب پر نور گشت است ایں فلک

وز ادب معصوم و پاک آمد مَلک

فرماتے ہیں، یہ آسمان ادب کی وجہ سے ہی روشن و مستنیر ہے اس پر چاند سورج تارے چمک رہے ہیں، ادب کی عظمت کو بیان فرما کر فرشتے ادب کی وجہ سے ہی پاک وطیب ہیں، آسمان کے ادب پر قرآن مقدس کا یہ ارشاد بڑی واضح دلیل ہے ۔ جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو یہ حکم دیا کہ تم خوشی سے اطاعت گزار ہو یا جبر سے تو دونوں نے عرض کی ''قالتا اتینا طائعین'' ہم دونوں خوشی سے حاضر ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں اس قدر اطاعت گزار ہیں کہ ان کے طلوع وغرب ہونے میں رائی بھر کا فرق نہیں، وقت کی پابندی زبردست ہے۔ اطاعت میں کسی قسم کی کمی نہیں، اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں فرشتوں کے مؤدب ہونے کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس عنوان کو قرآن مقدس نے اس طرح ذکر فرمایا ہے تمام فرشتوں نے کہا ''سبحانك لا علم لنا '' اے رب قدوس تو پاک ہے ہمیں صرف یہی معلوم ہے جو ہمیں تو نے سکھایا ہے، فرشتوں نے بارگاہ قدس میں ادب کو ملحوظ رکھا، طیب وطاہر رہے، ابلیس نے بے ادبی کی سرکشی کا مرتکب ہوا، رسوا وذلیل ہوگیا۔

بدز گستاخی کسوفِ آفتاب

شد عزازیلے زجرأت ردّ باب

گستاخی اور بے ادبی کے اثرات کے سلسلہ میں فرمایا جا رہا ہے، سورج گرہن بھی لوگوں کی گستاخی کے باعث ہی ہوتا ہے، اور شیطان اپنی گستاخی سے ہی

بارگاہ سے راندہ گیا۔ مولانا فرمارہے ہیں جب لوگ فسق و فجور میں حدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ دینی احکام کو پامال کرنے لگ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورج گرہن ہو جاتا ہے کہ لوگ قدرت کا یہ عظیم کرشمہ دیکھ کر ڈر جائیں اور گناہوں سے باز آ جائیں، بعض لوگوں کا خیال تھا کہ سورج گرہن کسی بڑی موت پر ہو جاتا ہے، حضور ﷺ نے اس خیال کی اس طرح تردید فرمائی'' لا تکون لموت احد ولا لحیوۃ احد ولکن یخوف اللّٰہ عبادہ ''فرمایا یا سورج گرہن کسی کی موت یا کسی کے جینے کے سبب نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ڈراتا ہے۔

ہر کی گستاخی کند اندر طریق
گردد اندر وادی حیرت غریق

اس شعر میں گستاخی اور بے ادبی کے ایک اور برے نقصان کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ جو شخص بھی طریقت وسلوک کی راہ میں گستاخی کرتا ہے وہ اس گناہ و جرم کے سبب حیرت کے دریا میں ڈوب جاتا ہے، دریائے حیرت میں ڈوبنا ہلاکت و بربادی ہے۔ ان اشعار میں حضرت مولانا نے ادب واحترام کی اہمیت کو بیان فرمایا اور بے ادبی و گستاخی کے خطرناک انجام کا ذکر کیا ہے، سلوک و طریقت کی راہ میں یہ دو پہلو بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں ان دونوں کو مدنظر رکھ کر چلنا کامیابی ہے اور ان سے لا پرواہی بربادی ہے۔

حال شاہ و میہمان بر گو تمام
زانکہ پایا نے ندارد ایں کلام

ادب واحترام کی اہمیت اور گستاخی و بے ادبی کے نقصانات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ عنوان تو بہت بڑا طویل ہے، ہزاروں روایات وواقعات اس پر بیان کیئے جا سکتے ہیں، اب بادشاہ اوراس کے مہمان کا حال سناؤ، بادشاہ کی ملاقات اس طبیب الٰہی سے جس کوخواب میں دیکھا تھااور جس کے آنے کی خوشخبری اُسے سنائی گئی تھی۔

شہ چو پیش مہمان خویش رفت
شاہ بود لیک پس درویش رفت

بادشاہ جب اپنے مہمان کے پاس گیا اگر چہ وہ بادشاہ تھا مگراس کے سامنے عجز وانکساری بالکل ایک درویش بن کر گیا۔اس شعر میں مولانا فرماتے ہیں مہمان تھا تو مسافر مگر وہ ایک مرد خدا تھا جس کے آگے بادشاہ کی بادشاہی جھک گئی گو یہ تھا تو بادشاہ مگر فقیرانہ اور عاجزانہ انداز میں اس فقیر کے سامنے آیا۔

دست بکشاد وکنارانش گرفت
ہمچو عشق اندر دل و جانش گرفت

اُس نے ہاتھ پھیلا کر معانقہ کیا گلے لگایا، عشق کی طرح اُسے دل وجان میں لیا، ہاتھ کھول کر مہمان کو اپنی بغل میں لیا، دونوں طرف سے معانقہ کیا گیا، دوسرے مصرعہ میں اس طرح تشبیہ دی گئی جیسے عشق کو جان اور دل میں جگہ دیتے ہیں ایسے ہی اُسے بھی جان اور دل میں جگہ دی۔ مہمان کو اس کے دل نشیں ہونے میں عشق سے تشبیہ دی گئی جو ایک پر لطف تشبیہ ہے۔

دست و پیشانیش بوسیدن گرفت
وز مقام وراہ پرسیدن گرفت

گلے ملنے، معانقہ کرنے کے بعد اس کا ماتھا چوما ہاتھ چوما اور پھر مقام اور راستہ کا حال پوچھنا شروع کیا، جیسے ہم اپنے کسی دوست سے ملاقات کے بعد اس کے حالات پوچھتے ہیں، سفر کیسا گزرا، راستہ میں ٹھیک رہے، اُس نے اس اخلاص ومحبت مہمان سے جگہ اور راستہ کے سوالات کیئے۔ یہ انداز محبت تھا گفتگو کو لمبا کرنے کا انداز تھا کہ ذوق بڑھے ورنہ بادشاہ کو خواب کے ذریعہ اس کا آنا معلوم تھا، گفتگو کو لمبا کیا گیا کہ ذوق محبت میں اضافہ ہو یہ انداز محبت اسی طرح ہی تھا جیسے موسیٰ علیہ السلام سے طور پر پوچھا گیا تھا تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس کا جواب تو صرف اتنا ہی کافی تھا یہ عصا ہے مگر آپ گفتگو کو لمبا کرنے اور محبوب حقیقی سے بات کو لمبا کرنے کیلئے جواب دیا، یہ عصا ہے اس پر ٹیک لگاتا ہوں بکریوں کیلئے پتے جھاڑتا ہوں اور بھی اس میں بہت سے فائدے ہیں۔

صبر تلخ آمد و لیکن عاقبت
میوۂ شیریں دہد پُر منفعت

اس شعر میں حضرت مولانا محبوب کی ملاقات میں دکھ، رنج اور دشواریوں پر صبر کا ذکر فرماتے ہیں کہ صبر یوں تو ناگوار ہوتا ہے اور پریشانی کا سبب بنتا ہے مگر آخرکار نتیجہ اچھا لگتا ہے یہ صبر کا پھل میٹھا دیتا ہے اگرچہ صبر کڑوا تو ہے مگر پھل میٹھا دیتا ہے

گرچہ ہے صبر کا آغاز بڑا تلخ و ترش
پر ہزار لطف ہے انجام شکیبائی میں

صبر کا معنی مشکلات کو کھولنے کا بھی آتا ہے، خصوصاً صوفیاء کے نزدیک یہی معنی اہمیت رکھتا ہے۔

گفت اے نورِ حق و دفعِ حرج
معنی الصبر مفتاح الفرج

بادشاہ نے اپنے اس معزز مہمان سے کہا اے خدا کے نور اور مشکلات کو حل کرنے والے یہ حدیث شریف جس میں ذکر ہے کہ صبر رزق کی کشادگی کی کنجی ہے اس کا مصداق تو تو ہی ہے کہ میں نے اپنی مصیبت پر صبر کیا تو اس صبر کے صلہ میں رب قدوس جل مجدہ نے آپ کو میری طرف بھیج دیا، اب تیری آمد سے میری مشکلات حل ہوں گی مجھے تو محسوس ہوتا ہے اس حدیث شریف کے مضمون کے مصداق آپ ہی ہیں۔

اے لقائے تو جواب ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

پھر بادشاہ اپنے خواب میں آنے والے معزز مہمان سے کہتے ہیں اے مقدس ومبارک شخص تیری زیارت ہر سوال کا جواب ہے تیری زیارت سے مشکل حل ہو جاتی ہے، آپ کی زیارت ایک ایسی بے مثال دولت ہے ایسی غیبی روشنی ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی دل کی ساری اُلجھنیں دور ہو جاتی ہیں اور شک وشبہات کی اندھیری رات ختم ہو جاتی ہے، تیری ملاقات ہر الجھن کا حل ہے۔

ترجمان ہر چہ مارا در دل ست
دستگیر ہر چہ پایش در گل است

بادشاہ اپنے اس معزز مہمان سے کہتا ہے اللہ نے تجھے یہ طاقت دی ہے کہ تو ہمارے دل کی ہر بات واضح کر دیتا ہے اور تو ایسا مہربان ہے مددگار ہے کہ کیچڑ میں پھنسے ہوئے لوگوں کو نکال لیتا ہے مصیبت میں ان کے کام آتا ہے ان کی دستگیری کرتا ہے۔

مرحبا یا مجتبیٰ یا مرتضیٰ
ان تغب جاء القضاء ضاق الفضاء

بادشاہ اپنے جنوں محبت میں خواب میں آنے والے معزز و محترم مہمان سے کہتا ہے پسندیدہ برگزیدہ مہمان اگر آپ چلے گئے تو ہم مشتاقان دید کی موت آ جائے گی اور ہماری زندگی کا مکان تنگ و تاریک ہو جائے گا۔ حضرت مولانا کے اس شعر میں مرتضیٰ مصطفیٰ کا معنی محض آنے والے بزرگ کا ہی کیا ہے، اگر ان الفاظ مبارکہ کو حقیقی معنوں میں لیا جائے تو میرے نزدیک کوئی حرج نہیں، در حقیقت مصطفیٰ اور مرتضیٰ سید الانبیاء ہیں اور اس حقیقت میں بھی کوئی شک نہیں کہ مومن کو اُن سے دوری یقینی موت ہے اور اس کی زندگی کا میدان تنگ ہے۔

انت مولی القوم من لا یشتھی
قد ردیٰ کلا لئن لم ینتہ

بادشاہ اپنے اس معزز و محترم مہمان کے بارہ میں مزید عرض کرتا ہے اے قوم

کے رہبر و راہنما! جو شخص تجھ سے دور ہے تجھے نہیں چاہتا اس کی بربادی میں کوئی شک و شبہ نہیں وہ یقیناً ہلاک ہوگیا۔ مولانا نے اس شعر میں آیہ مبارکہ ''کلا لئن لم ینتہ لنسفعا بالناصیہ'' سے اقتباس کیا ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں رب قدوس جل مجدہٗ نے ابلیس کے بارہ میں فرمایا ہے اگر وہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت نہیں چھوڑے گا تو ہم اس کے بال پکڑ کر جہنم کی طرف گھسیٹیں گے، اس میں فرما رہے ہیں کہ ولی سے محبت نہ رکھنا بربادی ہے کہ وہ اس مرد درویش کی توجہات وعنایات سے محروم رہے گا کہ ولی کی نگاہ کرم روح کی حیات ہے اس سے بغض وعداوت بربادی ہے جس کی تائید اس حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے جس نے میرے کسی دوست سے دشمنی مول لی تو میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں، اہل اللہ سے دشمنی کرنا خدائے قدوس سے جنگ کرنا ہے اور وہ کون ہے جو خدا سے جنگ لڑ سکے۔

چوں گزشت آن مجلس و خوان کرم
دست او بگرفت و برد اندر حرم

جب وہ مجلس برخاست ہوئی اور ضیافت کا خوان کرم بڑھایا گیا تو بادشاہ نے اس مہمان کا ہاتھ پکڑا اور حرم سرا میں لے گیا یعنی اس طبیب کو جو جسمانی طبیب بھی ہے روحانی بھی ہے اپنے گھر لے گیا کہ بیمار کا حال دکھا دے۔

قصہ رنجورد رنجوری بخواند
بعد ازاں در پیش رنجورش نشاند

بادشاہ اس طبیب غیبی کو بیمار کے پاس لے گیا اور اس کی بیماری کا سارا حال

سنایا اور اس غیبی طبیب کو بیماری کی تشخیص کیلئے بیمار کے پاس بٹھا دیا۔

رنگ رود نبض قارورہ بدید

ہم علاماتش ہم اسبابش شنید

اس طبیب غیبی نے مریض کا رنگ دیکھا، نبض دیکھی قارورہ دیکھا، اس طبیب غیبی نے اس بیمار کی اچھی طرح تشخیص کی، علامات کا جائزہ لیا اس بیماری بڑھنے کے اسباب پوچھے اور مریض سے وجوہات پوچھیں۔

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند

آن عمارت نیست ویراں کردہ اند

اس طبیب غیبی نے جب بیمار کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تو اپنا فیصلہ اس طرح سنایا کہ اس وقت تک جتنے طبیبوں نے اس کا علاج کیا ہے اس سے اسے صحت نہیں ہوئی، اس صحت کی عمارت بنی نہیں بلکہ خراب ہوئی ہے، اس بیمار کی تکلیف کوئی اور تھی، علاج اس کے خلاف کوئی اور ہوتا رہا، اُن طبیبوں کے علاج سے اسے کسی قسم کا فائدہ نہ ہو سکا کہ معالجوں نے اس مریض پر جو دوائیں استعمال کیں وہ بے کار ہو گئیں کہ عاشق کے زخموں پر دنیا کی دوائی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

امیر خسرو علیہ الرحمہ نے اس عنوان پر خوب فرمایا:

علاج خویش مکن ضائع اے طبیب ایں جا

کہ بر جراحت عاشق دوا ندارد سود

فرماتے ہیں اے طبیب اس جگہ علاج کو ضائع نہ کر کہ عاشق کے زخموں پر یہ

دوائی اثر نہیں کرسکتی۔

بے خبر بودند از حال درون
استعیذ اللہ مما یفترون

مولانا فرماتے ہیں بیمارِ عشق کے معالج طبیب اندر کے حالات سے بے خبر تھے، وہ بیمار کی تشخیص غلط کرتے رہے اور غلط ہی بتاتے رہے ہیں ان کی غلط بیانی سے پناہ مانگتا ہوں، طبیب لا علاج مریض کو بچانے کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر میری اندر کی بیماری کو نہیں پہچانتا۔

دید رنج و کشف شد بروئے نہفت
لیک پنہاں کردد باسلطان نگفت

اس روحانی طبیب نے بیماری کا جائزہ تو لے لیا اور مریض کی صحیح صورت حال کو جان لیا مگر یہ صورت حال بادشاہ پر واضح نہ کی کہ اس وقت اس طبیب روحانی نے سرسری طور پر معائنہ کیا تھا قطعی اور آخری تحقیق نہ تھی، محض گمان کے طور پر بیان کرنا مناسب نہ جانا اس روحانی طبیب کو معلوم ہو گیا کہ یہ کنیز بادشاہ کے علاوہ کسی اور کے عشق میں مبتلا ہے اس لئے بادشاہ کو اظہار کرنا مناسب نہ جانا۔

رنجش از صفرا و از سودا نبود
بوئے ہر ہیزم پدید آید زدود

اس مریض کی بیماری صفرا اور سودا کی وجہ سے نہ تھی اس طبیب حاذق نے

حالات سے معلوم کرلیا کہ اس کو بیماری ہے کیا اس طبیب غیبی نے اسے معلوم کرلیا جیسے ہر لکڑی کی بو اس کے دھوئیں سے معلوم ہو جاتی ہے، طبیب غیبی کو یہ بات واضح ہوگئی کہ اصل بیماری ہے کیا؟

دید از زاریش گو زار دل ست
تن خوش است واو گرفتار دل ست

اس طبیب روحانی سے مریض کی آہ وزاری سے اس کی کمزوری سے اس کی پریشانی سے یہ محسوس کرلیا کہ وہ مریض عشق ہے اس کا جسم تو اچھا بھلا ہے کسی کی محبت میں دل بیمار ہے۔

عاشقی پیدا ست از زاری دل
نیست بیماری چو بیماری دل

دل کی پریشانی سے عشق کا پتہ چلتا ہے اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ عشق کی بیماری سب سے سخت بیماری ہے کنیز کے دل کی پریشانی بتا رہی ہے کہ یہ مریض عشق ہے، دل کی بیماریوں میں سب سے بڑی بیماری عشق ہے اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ دل کی بیماری جسم کی تمام تر بیماریوں سے زیادہ خطرناک ہے، دل کی بیماری کا علاج کوئی صاحب دل طبیب ہی کرسکتا ہے، عام طبیبوں کے بس کا روگ نہیں۔

علت عاشق زعلتہا جدا ست
عشق اُصطرلاب اسرار خداست

فرماتے ہیں عشق کا مرض تمام بیماریوں سے انوکھا ہے حیران کن ہے عشق وہ حسین بیماری ہے جس سے معرفت الٰہیہ کیلئے بند دروازے کھل جاتے ہیں اور مریض کی نگاہ پردوں سے پار کے مشاہدات کرلیتی ہے، اوراس پر اسرارالٰہیہ منکشف ہوتے ہیں۔

عاشقی گرزیں سرو گرزاں سرست
عاقبت مارا بداں شہ رہبرست

اس شعر میں حضرت مولانا فرماتے ہیں عشق کسبی ہو، مجازی ہو یا حقیقی نتیجہ اس کا یہی ہوتا ہے کہ وہ محبوب حقیقی تک پہنچاتا ہے عشق حقیقی کا محبوب حقیقی تک لے جانا تو بڑی واضح بات ہے مگر عشق مجازی بھی اسی منزل تک پہنچا دیتا ہے، مولانا جامی بھی تائید کرتے ہیں

متاب از عشق رو گرچہ مجازی ست
کہ آن بہر حقیقت کارسازی ست

عشق حاصل کردہ مجازی ہی کیوں نہ ہو، کہ وہ محبوب حقیقی تک پہنچانے کا سبب بن جائے گا۔ کسی نے خوب کہا ہے

کھولا ہے یہ سرّ حقیقت مجاز نے　　　　یہ پختگی صلہ ہے خیالات خام کا

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں ایک اور حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ عشق مجازی ہر شخص کیلئے راہنمائی نہیں کرتا اور نہ ہی ہر شخص کو اس کی اجازت ہے، یہ عشق مجازی صرف اہل اللہ کی راہنمائی کرسکتا ہے، یہ بھی یاد رہے عشق مجازی عالم عارف کیلئے ہدایت ہے، کامیابی ہے اور جاہل کیلئے عظیم وبال ہے، اس میں شک نہیں کہ اہل

معرفت کے نزدیک عشق مجازی برحق ہے مگر جاہل لوگ اس آڑ میں گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں، اُنہیں دیکھ کر عوام بھی فریب کا شکار ہو جاتے ہیں یہ ایک اہم ترین نازک مسئلہ ہے جس کے سمجھنے کیلئے بہت غور و فکر کی ضرورت ہے، عشق مجازی صرف انسانوں کے حسن و جمال پر ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی مخلوق کے حسن و جمال پر فریفتگی ہے اس مخلوق کی تخلیق پر حیرت اور کمال قدرت کا تصور بھی عشق مجازی ہے کہ اس مخلوق پر غور و فکر سے خالق تک رسائی کے راستے کھل جاتے ہیں۔ اس میدان میں نہایت محتاط ہو کر چلنے کی شدید ضرورت ہے مجازی کے راستہ میں گڑھے اور ٹھوکریں بہت ہیں جن سے بچنا ضروری ہے، اس راستہ میں چلنے کیلئے بڑی قابلیت اور صلاحیت کی شدید ضرورت ہے اور یہ چیز ہر کسی کو حاصل نہیں ہوسکتی۔

اس سلسلہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مقدس عمل رہنمائی کرتا ہے کہ آپ نے ایک ستارہ میں شانِ خدائی کا جلوہ دیکھا تو فرمایا یہ میرا رب ہے مگر جب وہ غروب ہو گیا تو فرمایا میں غروب ہونے والی چیزوں کو پسند نہیں کرتا، مجازی عشق میں بھی اس صورت حال کو سامنے رکھ کر چلنا مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ بالآخر آپ کا یہ فرمانا کہ ”انی وجہت وجہی للذی فطر السموات والارض حنیفا و ما انا من المشرکین“ میں نے تو اپنا رخ کسی حقیقی ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں زمینوں کو بنایا ہے اور میں مشرکوں سے نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ کا جلیل القدر نبی ستارہ میں حسن دیکھ کر متوجہ ہوا مگر جب وہ غروب ہوا تو حقیقی محبوب کی طرف متوجہ ہوا، مجاز سے حقیقت کی طرف جانے کا یہ انداز ہو تو کامیابی ہوسکتی ہے ورنہ یہ راہ خطرات سے پُر ہے، قدم قدم پر لغزش ہے

ٹھوکر ہے، اہل اللہ اور کامل واکمل صوفیاء ہیں جو اس راہ پر چل سکتے ہیں اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ہر چہ گوئم عشق را شرح و بیاں
چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں

اس شعر میں حضرت مولانا نے عشق کی کیفیت کو بیان کیا ہے، فرماتے ہیں میں جب عشق کو دیکھتا ہوں یا وادی عشق سے گزرتا ہوں تو مجھے شرمندگی ہوتی ہے کہ عشق ایک وجدانی کیفیت ہے جسے تحریر و تقریر میں سمویا نہیں جا سکتا اس کی صفت بیان کے احاطہ سے باہر ہے اگر چہ زبان سے عشق کی تشریح پر روشنی ڈالی جاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ عشق زبان کے بغیر ہی روشن ہے، اس کی کیفیت عاشق پر بغیر زبان کی حرکت کے منکشف ہو جاتی ہے، اس عنوان پر اقبال مرحوم کا یہ شعر اچھی روشنی ڈالتا ہے۔

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

اسی عنوان کو اگلے شعر میں اس طرح فرماتے ہیں:

چوں قلم اندر نوشتن میشتافت
چوں بعشق آمد قلم بر خود شگافت

فرماتے ہیں قلم حالات وکوائف کو لکھنے میں مصروف تھا، جونہی وہ عشق پر آیا تو شق ہو گیا ، عشق کی حقیقت زبان یا قلم ادا نہیں کر سکتے یہ دونوں ہی اس کی اصلیت کو بیان کرنے سے عاجز ہیں، قلم ہمت تو کر سکتا ہے لکھ سکتا ہے مگر جب عنوان عشق پر آئے تو عاجز و

کمزور ہے۔

چوں سخن در وصف ایں حالت رسید
ہم قلم بشکست و ہم کاغذ درید

فرماتے ہیں جب بات عشق کے اظہار تک پہنچی تو قلم ٹوٹ گیا، کاغذ پھٹ گیا، کتابوں کی ورق گردانی سے عشق کا پتہ نہیں چلتا کہ اوراق میں اس دولت کو اٹھانے سنبھالنے کی ہمت ہی نہیں۔

عقل در شرحش چوخر در گل بخفت
شرح عشق و عاشقی ہم عشق گفت

عشق کتاب اور قلم کے ذریعہ دریافت کرنے کی مثال فرماتے ہیں، عشق کی شرح کرتے عقل کی حالت بالکل ایسے ہی ہے جیسا گدھا کیچڑ میں پھنس گیا تو بیچارہ ہے بے بس ہے ایسے ہی عقل کی صورت حال ہے جب عشق کے عنوان پر عقل بڑھتی ہے تو حیرت و تعجب، بے بسی اور عاجزی کے کیچڑ میں پھنس جاتی ہے عقل بڑے بڑے مسائل حل کر لیتی ہے مگر عشق کی تشریح و تفصیل سے بالکل عاجز ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب
گر دلیلت باید از وے رومتاب

اس سے پہلے اشعار میں فرمایا گیا کہ عشق کی کیفیت بیان کرنے سے زبان عاجز ہے قلم بھی بے کار ہے اور عقل بھی بے بس ہے، عقل کا تو یہ حال ہے جیسے گدھا

کیچڑ میں پھنس کر بے بس ہے، عاجز ہے عقل بھی ایسے ہی عشق بیان کرنے میں بے بس ہے اس شعر میں فرماتے ہیں جو شخص مرض عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ اپنے اس مرض کے ذریعہ ہی عشق سے آگاہ ہو جاتا ہے، اُسے کسی خارجی دلیل کی محتاجی نہیں، نہ ہی کوئی خارجی دلیل اُسکی رہنمائی کرسکتی ہے۔ اس شعر میں اس کی مثال بیان کرتے ہیں کہ جیسے سورج ہی سورج کی دلیل ہے اگر کوئی شخص عشق کے حالات سے واقف ہونے کی تمنا رکھتا ہے تو اس میدان عشق میں آکر ہی آگاہی حاصل کرسکتا ہے۔

از وے ارسایہ نشانے مے دہد
شمس ہر دم نور جانے مے دہد

پچھلے شعر میں آفتاب کی مثال بیان کر کے مسئلہ عشق پر تبصرہ کیا تھا جیسے آفتاب خود ہی اپنی دلیل ہے اسے کسی دلیل کی محتاجی نہیں، ایسے عشق خود ہی اپنی دلیل ہے اس شعر میں فرماتے ہیں اگرچہ آفتاب کا معلوم کرنا کسی واسطہ کے بغیر ہے مگر پھر بھی اس کا مشاہدہ ہے، آفتاب حقیقی کے مقابلہ میں ناقص ہے کہ سورج کی حقیقت معلوم کرنے میں اسکی دھوپ کا ہونا واضح ہے۔ گویا دھوپ کا ہونا آفتاب کی پہچان کیلئے لازمی ہو اور آفتاب دھوپ کا محتاج ہو مگر آفتاب کسی کا محتاج نہیں، اس مادی آفتاب کی پہچان دھوپ کی محتاج ہوئی، دھوپ ہو گی تو سورج ہو گا مگر آفتاب حقیقی کا نور ہر وقت ہر لمحہ ہر آن روشن و درخشاں ہے کسی کا محتاج نہیں، اس آفتاب حقیقی کے بارہ میں کسی نے خوب کہا ہے۔

کھلا جتنا ہوا اتنا ہی مستور چھپا جتنا رہا کھلتا بدستور

سایہ خواب آرد ترا ہمچوں سمر
چوں برآید شمس انشق القمر

اس شعر میں بھی حضرت مولانا نے ظاہری آفتاب اور آفتاب حق کو مثال کے طور پر بیان کیا ہے فرمایا ظاہر آفتاب کی خرابی تو یہ ہے کہ اس کے چھپ جانے سے سستی پیدا ہوتی ہے، اندھیرا چھا جاتا ہے نیند مسلط ہوتی ہے اور آفتاب حق تو غروب ہی نہیں ہوتا، وہ تو ہر لمحہ روشن و درخشاں ہے۔ دونوں آفتابوں کا تقابل بتایا ہے ایک کا غروب ہونا باعث غفلت ہے اور ایک کا ہر لمحہ درخشاں رہنا باعث کمال ہے باعث عظمت ہے۔

خود غریبے دو جہاں چو شمس نیست
شمس جاں باقی ست کورا امس نیست

فرماتے ہیں ظاہری آفتاب تو طلوع وغروب کے چکر میں رہتا ہے کبھی ظاہر کبھی غائب کہیں روشن کہیں تاریک لیکن آفتاب حق تو ہر لمحہ روشن و درخشاں ہے اس کے ساتھ آج اور کل کا کوئی مسئلہ نہیں جبکہ ظاہری آفتاب آج کل کی قید میں مقید ہے آج کل ہونے کا تعلق سورج کے طلوع وغروب ہونے سے ہے جبکہ آفتاب حقیقی طلوع وغروب کی صفات سے پاک ہے۔

شمس در خارج اگرچہ ہست فرد
مثل او ہم میتواں تصویر کرد

اس شعر میں فرماتے ہیں اگرچہ آسمان کا آفتاب ایک ہی ہے مگر زمین میں اس جیسے کئی آفتابوں کا تصور کیا جاسکتا ہے اور یہ کوئی مشکل نہیں لیکن آفتاب حق میں اس قسم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس فلکی آفتاب کا ذہن میں تصور پیدا ہو جانا بھی آفتاب حق کے مقابلہ میں ناقص کر رہا ہے۔

اگلے شعر میں اسی مضمون کو مزید وضاحت سے فرمارہے ہیں،

لیک آن شمسیکہ شد مستتش اثیر
بنورش در ذہن و در خارج نظیر

فرماتے ہیں وہ آفتاب حق جو پوری کائنات پر محیط ہے اور ساری کائنات اس کیلئے تابع ہے اس کی مثال نہ تو ذہن میں آسکتی ہے نہ خارج میں۔ اس ضمن میں کسی نے کیا اچھا کہا ہے

اس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے
کیا گزر ہو اس پر تعقل کے قدم کی

کئی آفتابوں کا ذہن میں نقشہ بنایا جاسکتا ہے مگر آفتاب حقیقی میں یہ صورت بھی ممکن نہیں۔

در تصور ذات اور را گنج کو
تا دو آید در تصور مثل او

پہلے شعر کے مضمون کی تائید میں فرماتے ہیں کہ آفتاب حق کا تصور بھی ممکن نہیں، فرمایا کسی شے کی مثال تو اسی وقت ذہن میں آئے گی جب خود اس کی ذات

متصور ہو سکے اور ذات خداوندی کا تصور شرعاً عقلاً محال ہے جب اس کی ذات کا تصور ممکن نہیں تو اس کی نظیر تصور میں کیسے آ سکے گی۔

شمس تبریزی کہ نور مطلق است
آفتاب است و زانوار حق ست

پچھلے اشعار میں آفتاب حق اور آسمانی آفتاب پر تبصرہ فرما رہے تھے اس شعر میں حضرت مولانا کا خیال اپنے شیخ و مرشد ہادی کی طرف منتقل ہے، اور وہ شمس تبریزی ہیں جو شمسِ ظاہری اور شمس حق کی طرح ہیں فرماتے ہیں یہ شمس طلوع وغروب کی قید سے پاک ہے مگر شمس حق کی نسبت سے کم ہے بلکہ وہ اسی کے انوار سے ایک نور ہے۔

چوں حدیث روئے شمس الدین رسید
شمس چارم آسماں سرور کشید

پہلے شعر میں بھی مولانا نے اپنے شیخ کی تعریف کی ہے اس میں بھی پھر نذرانہ عقیدت پیش کر رہے ہیں، فرماتے ہیں حسن اتفاق سے شمس تبریزی کا ذکر خیر آ گیا ہے تو اس شمس کے ذکر آنے پر آسمان کے شمس نے شرمندگی سے منہ ڈھانپ لیا ہے کہ آسمانی شمس شمس تبریزی کے مقابلہ میں آ ہی نہیں سکتا۔ شمس تبریزی اپنی خوبیوں میں آسمانی شمس سے بہت زیادہ آگے ہیں۔ شمس تبریزی کا نام آتے ہی شمس آسمانی ماند پڑ گیا۔

واجب آمد چونکہ بُر دم نام او
شرح کردن رمزے از انعام او

فرماتے ہیں چونکہ میری زبان پر ان کا نام آگیا ہے تو مجھ پر ضروری ہو گیا ہے کہ ان کے بے پایاں انعامات کا بھی کچھ ذکر کروں، اللہ ان پر رحمات کا نزول فرمائے کہ انہوں نے میری تربیت کی مجھے محبوب سے ملایا، ورنہ میری کہاں تھی ہمت جانِ جاں تک پہنچتا

این نفس جاں دامنم بر تافتہ ست

بوئے پیراہان یوسف یافتہ ست

اس شعر میں بھی حضرت مولانا نے اپنے شیخ شمس تبریزی کی مدح کی ہے فرماتے ہیں جب ان کا نام میری زبان پر آیا تو میرے دل میری روح نے ان کے انعامات و محبت کا ذکر کرنے پر مجبور کر دیا اور یہ ان کی یاد مجھے ایسے ہی محسوس ہوئی جیسے یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے پیراہن کی خوشبو محسوس فرمائی اور فرمایا'' انی لاجد ریح یوسف'' میں یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں۔

پیراہن یوسف کا ذکر کرنے میں اشارہ ہے کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ مولانا بات کہاں کی کہاں لے گئے، واقعہ تو کنیز کے عشق کا تھا، ذکر مرشد کا شروع کر دیا تو فرمایا میں بھی یعقوب علیہ السلام کی طرح محبوب کی چمک سے بے خود ہو گیا ہوں لہذا ذکر کر دیا ہے عشق و محبت کا مرحلہ ہی ایسا ہے، بات کوئی بھی زبان پر آئے، نام محبوب کا ہی نکلتا ہے ذکر محبوب کے بغیر کوئی بات نکلتی ہی نہیں۔

کز برائے حق صحبت سالہا

باز گو رمزے ازاں خوش حالہا

فرماتے ہیں میری روح میرے مرشد کے ذکر خیر پر اس لئے مجبور کر رہی

ہے کہ پرانے حق صحبت کیلئے کچھ نہ کچھ ذکر کروں اور اپنی وفاداری اخلاص اور عقیدت کا حق ادا کروں۔

تا زمین و آسماں خندہ شود

عقل و روح دیدہ صد چنداں شود

اپنے شیخ سے وابستگی کا پھر ذکر اس طرح فرماتے ہیں جو کچھ میرے مرشد نے مجھے عطا کیا جو کچھ اسرار حقیقت بتائے اگر میں وہ بیان کروں تو زمین و آسماں خوش ہوں گے اور ہنسیں گے روح اور دل کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔

اسی عنوان پر کسی نے خوب کہا ہے۔

تصوف کے بیاں کو ہوش نے روح آشنا پایا

معانی کچھ نہ سمجھا پر قیامت کا مزا پایا

گفتم اے دور اوفتادہ از حبیب

ہمچو بیماریکہ دور است ازطبیب

اپنے ذوق محبت میں روح سے فرماتے ہیں اے روح تو جو اپنے شیخ و مرشد سے ایسے دور ہے جیسے بیمار حکیم سے دور ہو۔

لا تکلفنی فانی فی الفناء

کلت افہامی فلا احصی ثنا

روح کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں، اے میری روح مجھے اپنے شیخ و مرشد کی

تعریف پر مجبور نہ کر، میں حالت جنون و بے خودی میں ہوں، اس وقت میرے ہوش و حواس قابو میں نہیں ایسی صورت حال میں اپنے شیخ کی تعریف کیا کرسکتا ہوں؟ روح سے معذرت کرتے ہیں کہ میں تو فراق کے صدمہ سے بے بس ہوں ایسی صورت حال میں مدح کیا کرسکتا ہوں۔ مولانا کا یہ انداز بھی اپنے شیخ سے کمال محبت پر دلالت کرتا ہے۔

کل شی قالہ غیر المفیق
ان تکلف او تصلف لا یلیق

ہر وہ بات جو غیر عقل مند کہے گا اگر وہ اس میں تکلیف کرے گا تو یہ درست نہیں یعنی جس کے ہوش و حواس ٹھیک نہ ہوں اگر وہ تکلف کرے اپنی طبیعت پر زور ڈال کر بات کرے تو یہ اچھا نہیں یا یہ بندہ اپنے کمالات ظاہر کرنے کیلئے کوئی بات کرے تو اچھا نہیں لگتا ہوش و حواس تو اس کے ہیں نہیں کمالات کیا بتا رہا ہے، جب طبیعت متوجہ نہ ہو تو مضمون بنتا نہیں اسی ضابطہ کے پیش نظر مجھے معذور رکھنا چاہئے۔

ہر چہ میگوید موافق چوں نبود
چوں تکلف نیک نالائق نمود

پہلے عربی کے شعر کی تفصیل اسی فارسی شعر میں فرماتے ہیں، ہوش و حرس سے عاری بندہ جو کچھ بولتا ہے وہ ایک بناوٹ ہے غیر سنجیدہ ہے چونکہ اس کا بولنا موقعہ اور وقت کے مطابق نہیں ہوتا اسی چیز کے پیش نظر اس کی گفتگو نہایت غیر مناسب دکھائی دیتی ہے اور تکلیف کی وجہ سے اس کی وہ گفتگو مناسب معلوم نہیں ہوتی اس شعر میں بھی پہلے شعر والا عذر بیان ہو رہا ہے۔

من چگویم یک رگم ہشیار نیست

شرحِ آں یاریکہ آنرا یار نیست

اس شعر میں مولانا اپنی کمزوری اور کم علمی کا اظہار کر رہے ہیں اور یہ اظہار بطور عاجزی ہے انکساری ہے فرماتے ہیں میں حضرت حق کے بارہ میں کیا کہہ سکتا ہوں، کیا لکھ سکتا ہوں، میری تو کسی ایک رگ میں بھی ہوش نہیں ہے، لکھوں کیا میں ایسے محبوب کی شرح کیسے کروں، جس کا کوئی شریک نہیں، اوپر کے اشعار میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ انعام مرشد سے مراد وحدۃ الوجود ہے اس لئے اس شعر کو" آں یارے" سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں میں ہوش میں ہی نہیں شیخ کی تعریف کیا کروں۔

خود ثنا گفتن زمن ترک ثناست

کایں دلیلِ ہستی و ہستی خطاست

فرماتے ہیں میرا تعریف کرنا ہی خود تعریف نہ کرنا ہے اس لئے کہ یہ وجود کی دلیل ہے اور وجود غلط ہے کہ میں فنا کے مقام میں ہوں کیا خوب کہا کسی نے

کیسی طلب کہاں کی طلب کس لئے طلب

ہم ہیں تو وہ نہیں وہ ہے تو ہم نہیں

اس شعر میں بھی مولانا اپنے نظریہ وحدۃ الوجود کو ہی پیش کر رہے ہیں۔

شرح ایں ہجراں و ایں خونِ جگر

ایں زماں بگزار تاوقتِ دِگر

دردوفراق کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ اس ہجروفراق پر مشتمل اور خون جگر پلانے والی شے عشق ومحبت کی شرح کواب کسی دوسرے وقت کیلئے رکھو، اس شعر میں مولانا نے عشق سے مراد مسئلہ وحدۃ الوجود لیا ہے کہ اہل اللہ کا یہ عشق ہے سالک جس قدر بھی اس میں بڑھتا جائے وہ سیر نہیں ہوتا اور زیادہ اور زیادہ کی تمنا اس کے دامن گیر رہتی ہے موجودہ حالت پر قناعت نہیں کرتا، زیادہ کیلئے فکرمند رہتا ہے یہ کیفیت اس کے فراق کی ہے۔

قال اطعمنی فانی جائع

فاعتجل فالوقت سیف قاطع

پیاسی روح کی حالت کو بیان کرتے ہیں کہ روح نے کہا کہ مجھے وحدۃ الوجود کی غذا جلدی دے دیں بھوکی ہوں، وقت تیزی سے گزر رہا ہے، وقت کو کاٹنے والی تلوار سے تشبیہ کردی کہ جو وقت آتا ہے پہلے وقت کو کاٹتا چلا جاتا ہے، روح نے اپنی غذا کا مطالبہ کیا ہے اُس کی غذا وحدۃ الوجود کا نظریہ ہے۔

صوفی ابن الوقت باشد اے رفیق

نیست فردا گفتن از شرط طریق

اس شعر میں مولانا نے ابن الوقت صوفی سے خطاب کیا ہے کہ اے صوفی! آج کا کام کل پر نہ چھوڑ، ابن الوقت وہ صوفی ہے جو مغلوب الحال ہے، مغلوب الحال وہ ہے جس پر جو کیفیت طاری ہو اس میں مغلوب ہے ظاہری طور پر اس سے احکام کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے۔ابن الوقت کا دوسرا معنی یہ ہے ایسا صوفی جو اپنے پر قابو رکھتا

ہے، آداب کا لحاظ ہے شریعت کا پاس ہے حکمت خداوندی کو سمجھتا ہے، خدائی رازوں پر نگاہ رکھتا ہے۔ ابن الوقت صوفی کا ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے جو وقت کا حق ادا کرے پیش آنے والے واقعات وحالات پر عمل کرے آج کے کام کو کل پر نہ چھوڑے "الدنیا مزرعۃ الآخرۃ" کے اصول کو پیش نظر رکھے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے آج جو بوئے گا قیامت کو وہی اٹھائے گا۔

صوفی ابن الحال باشد در مثال
گرچہ ہر دو فارغ انداز ماہ و سال

اس شعر میں مولانا اوپر کے شعر سے ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا جواب دے رہے ہیں کہ صوفی کو ابن الوقت کہنا یا ابن الحال کہنا بطور مجاز ہے فرماتے ہیں جیسے صوفی وقت زمانے کا پابند نہیں، فرماتے ہیں اگرچہ صوفی اور وقت دونوں ماہ وسال سے مبرّا ہیں اسی طرح یہاں پر وقت کا معنی زمانہ کا نہیں بلکہ اصطلاحی معنی مراد ہے اس سے مراد قلبی واردات ہیں جن کو زمانے سے تعلق نہیں یہاں پر صوفی کو ابن الوقت یا ابن الحال کہنا بطور مجاز ہے۔

تو مگر خود مردِ صوفی نیستی
نقد را از نسیہ خیزد نیستی

مولانا نے اس سے پہلے شعر میں فرمایا تھا کہ صوفی ابن الوقت ہوتا ہے، ابن الوقت کا ایک معنی خاص ہے جو ابوالوقت کے مقابلہ میں ہے دوسرا معنی عام ہے جو دونوں کو شامل ہے، اس شعر میں اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں ابن الوقت کا معنی

عام مراد تھا ورنہ یہاں صوفی ہونے کی نفی کی جاتی۔ فرماتے ہیں شاید صوفی آدمی نہیں ہے تجھے اتنی بھی خبر نہیں کہ نقد کو ادھار سے نقصان پہنچتا ہے اس شعر میں بھی اسی بات کا اشارہ دیا جا رہا ہے کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑو۔

گفتمش پوشیدہ خوشتر سرِّ یار
خود تو در ضمن حکایت گوش دار

میں نے کہا محبوب کا بھید راز میں رہنا ہی بہتر ہے اگر سننا ہی ہے تو اس بات کے ضمن میں سن لو مطلب یہ ہے کہ واضح اور کھلے الفاظ میں اظہار بہتر نہیں، یہ بات اچھی نہیں کہ راز پردہ سے باہر ہو وہاں ایک مجازی قصے کے انداز میں حقیقت کو بیان کر دیا جاتا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اس شعر میں حضرت مولانا فرماتے ہیں، حقیقت کے رازوں کو حکایات کی روشنی میں ہی بیان کرنا اچھا ہوتا ہے کہ راز کھل بھی جائے اور راز بھی رہے۔ اس شعر میں مثنوی کے انداز تحریر کو بیان کیا جا رہا ہے کہ میری اس تحریر میں رازوں پر تبصرہ نہیں کیا گیا، حقائق کو بے حجاب نہیں کیا گیا بلکہ پردہ میں رکھ کر مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ عام تحریروں کی طرح کھل کر بحث سے پرہیز کیا گیا ہے، مولانا نے اس حکیمانہ انداز اور کمال صوفیانہ روش سے مثنوی شریف کو پرانے جلیل القدر بزرگوں کی کتابوں کے انداز سے وابستہ کر رکھا ہے اس عنوان کو یہ شعر بہت واضح کر رہا ہے۔

ذوق ہے جس کا صحیح آ جائے گا اس کو یقین
تیرے مے خانے کو ہے جنبش دے رہا روح الامیں

گفت مکشوف و برہنہ بے غلول
باز گورنجم مدہ اے بوالفضول

روح نے کہا اے فضول گفتگو کرنے والے مجھے زیادہ پریشان نہ کر، حقائق کو کھلا کھلا بیان کر اور اس میں کمی نہ آنے دے۔

باز گو اسرار و رمز مرسلین
آشکارا بہ کہ پنہاں سردیں

اس شعر میں بھی پہلے کی تائید ہے یہ بھی روح کی صدا ہے جو دوسرے انداز میں ذکر ہے، روح کہتی ہے، انبیاء علیہم السلام کے راز بیان کرو اور وہ بڑے واضح طور پر کھلے کھلے انداز میں بیاں ہوں اس شعر مین مرسلین کے رازوں سے مراد وحدۃ الوجود کا راز ہے، تمام انبیاء علیہم السلام نے ایک خدا وحدہٗ لاشریک کی تبلیغ کی ہے، لا الہ الا اللہ کا درس دیا ہے اس کے بغیر کوئی معبود نہیں وہی ذات ہے جو اپنے کمالات میں یکتا ہے، اسی کا معبود ہونا لازم ہے اسی بات کو اسرار مرسلین فرمارہے ہیں۔

پردہ بردار و برہنہ گو کہ من
مے نگنجم باضم در پیرہن

اس شعر میں بھی روح کی ایک اور تمنا کا ذکر فرمایا جا رہا ہے، روح کہتی ہے راز کا پردہ اٹھا دے کہ میں اپنے محبوب کی باتوں کو حکایات اور تمثیلات میں سننا نہیں چاہتی کہ واقعات محبوب کے سننے میں میرے اور واقعات محبوب کے درمیاں پیرہن کی اور جسم کی دوری بھی نہیں چاہتی۔ روح کہتی ہے میرے اور محبوب کے درمیان قمیص تک کی آڑ بھی نہیں چاہیئے۔ مجھے اسرار وحدت کے سننے کا اس قدر شوق ہے کہ حکایات جو لباس کے مرتبہ ہیں وہ بھی پسند نہیں۔

گفتم از عریاں شود او در عیان
نے تو مانی نے کنارت نے میاں

پچھلے چند شعروں میں روح کی باتوں اور تقاضوں کا ذکر تھا کہ اسرار کو واضح طور پر کھل کر بیان کرو، میں حکایات وتمثیلات کے انداز میں سننا پسند نہیں کرتی، اس شعر میں روح کو جواب دیا جا رہا ہے کہ اگر وہ راز تیرے اور سب کے سامنے کھل جائیں تو حالت یہ ہوگی کہ اے روح نہ تو رہے گی نہ کوئی تیرا کنارہ بچ سکے گا۔ ان رازوں کے افشا سے تیری حالت بگڑ جائے گی۔ وحدۃ الوجود کے رازوں کی عظمت کو بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ کس قدر اہم ہیں کہ روح بھی انہیں برداشت نہیں کر سکتی۔

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ
برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

اس شعر میں مولانا اپنی تمناؤں، مرادوں، آرزؤں کے متعلق راہنمائی فرماتے ہیں کہ اپنی مراد تمنا مانگ ضرور مگر اپنی بساط سے بڑھ کر کسی قسم کا سوال نہ کر،

اپنی بساط سے زیادہ مطالبہ زیادہ مانگ تباہی کا باعث ہے جیسے یہ ایک حقیقت واضح ہے کہ گھاس کا تنکا پہاڑ کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا اوراس کی تباہی ہے ایسے ہی تیری کیفیت ہے اپنی بساط سے زیادہ نہ مانگ۔ معنی یہ ہے اپنے حوصلے سے زیادہ فرمائش نہ کر کہیں تیرا وجود ہی برباد نہ ہو جائے، خاموش ہو جا اپنی مرضی خوشی سے مانگ مگر حیثیت کے مطابق مانگ مکھی نوالہ پر بیٹھ تو جائے گی مگراس نوالہ کا کھا جانا اس کے بس سے باہر ہے۔

آفتابے کزوے ایں عالم فروخت
اند کے گر پیش آید جملہ سوخت

پہلے شعر کی ہی وضاحت اس میں ہے فرماتے ہیں سورج جس سے سارا جہاں روشن ہے اگر اپنے مقام سے ذرا بھی آگے بڑھے تو سب کو جلا ڈالے۔ مولانا کا مفہوم یہ ہے کہ اگر حد ادب سے بڑھ جائیں تو وصال وبال بن جاتا ہے جیسے سورج کا نور دور سے فرحت بخش ہے، قریب ہو جائے تو مصیبت ہے، اکبرالٰہ آبادی کا ایک شعر اس کا ترجمان ہے۔

پروانے نے شمع سے لپٹنا چاہا
پہلے تھا نور میں اور اب نار میں ہے

تانگردد خوں دل جاں جہاں
لب بہ بندو دیدہ بند و دیں زماں

اس شعر میں حضرت مولانا فرماتے ہیں راز بیاں کرنے کی بجائے بہتر ہے تو اپنے لب سی لے اور آنکھیں بند کر لے تا کہ اس خطرناک بھید کے ظاہر کرنے سے ہستی عالم کا خون نہ ہو جائے۔اسی عنوان کو امیر خسرو نے اس طرح بیان کیا ہے۔

چہ پوشی پردہ بر رُوئے کہ آں پنہاں نمے ماند
وگر بے پردہ میداری تنے راجاں نمے ماند

بیش ازیں آشوب و خونریزی مجو
بیش ازیں از شمس تبریزی مجو

اسی عنوان کو دوسرے انداز میں فرمارہے ہیں کہ اس قسم کی خونریزی کے در پے نہ ہو اس سے آگے شمس تبریزی کا ذکر چھیڑ، جب ظاہری شمس سورج کے انوار کی تاب لانے کی ہمت نہیں اور ہم اس کے انوار و تجلیات کو برداشت نہیں کر سکتے تو شمس معنوی یعنی شمس تبریزی کے انوار و تجلیات کو یعنی وحدۃ الوجود کی تاب کب ہو گی، تبریزی کے بیان کیلئے اصرار نہ کر کہ اس میں فتنہ آشوب ہے۔

ایں ندارد آخر از آغاز گو
رو تمام ایں حکایت باز گو

فرماتے ہیں اس ذکر کا تو کوئی خاتمہ ہی نہیں چلو اب اس حکایت کا بقیہ سناؤ۔

حکایت

اس سے پہلے اشعار میں ایک بادشاہ کا لونڈی پر عاشق ہونے کا ذکر ہوا ہے، لونڈی کی بیماری اور اس کے علاج کا ذکر ہوا ہے یہ بھی ذکر ہوا کہ معالج لونڈی کے علاج سے عاجز آ گئے، بادشاہ کو معلوم ہو جانے اور حقیقی بادشاہ کی طرف رخ کرنے کا ذکر ہوا اس سے قبل رعایت ادب کی خواہش اور بے ادبی کی نحوست کا ذکر ہوا، ایک خدائی طبیب سے بادشاہ کی ملاقات کا ذکر ہے جسے اس نے خواب میں دیکھا تھا اور اس کی تشریف آوری کی اسے خبر دی گئی تھی پھر یہ بھی ذکر ہوا کہ بادشاہ غیبی طبیب کو بیمار کے پاس لے گیا۔ اگلے اشعار کا تعلق اس گزری حکایت سے رہے، ان اشعار میں سابقہ حکایت کا بقیہ بیاں کیا جا رہا ہے۔

چوں حکیم از ازیں سخن آگاہ شد
وز دروں ہمداستانِ شاہ شد

جب طبیب کو اس بات کا پتہ چل گیا اور اپنی روحانیت سے بادشاہ کا واقف راز ہو گیا۔

گفت اے شہ خلوت کن خانہ را
دور کن ہم خویش وہم بیگانہ را

تو اس طبیب نے بادشاہ سے کہا اے بادشاہ تخلیہ چاہئے جاننے نہ جاننے والوں سبھی کو گھر سے نکال دیں۔

کس ندارد گوش در دہلیز ہا
تا بہ پرسم از کنیزک چیزہا

کوئی بھی شخص ہماری بات نہ سن سکے تا کہ میں کنیز سے چند باتیں پوچھ سکوں ۔تنہائی کی ضرورت اس لئے تھی کہ یہ مریض عشق کا معاملہ تھا اور کوئی بھی شخص اپنے اس عشق کی بیماری کو دوسرے پر ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا، جان نکلتی نکل جائے مگر عشق کے راز کو آشکار کرنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔

خانہ خالی کرد شاہ و شد بروں
تا پُرسد از کنیزک او فسوں

طبیب کے حکم پر بادشاہ نے گھر خالی کرا دیا اور خود بھی باہر نکل آیا کہ وہ کنیزک سے اچھی طرح تحقیق کر لے۔

خانہ خالی کرد و یک دیارنہ
جز طبیب و جز ہماں بیمار نہ

پہلے شعر کی مزید تفصیل ہے کہ بادشاہ نے گھر خالی کر دیا اور کوئی گھر کا باشندہ وہاں نہ رہا گھر میں صرف طبیب تھا اور بیمار تھا۔طبیب اور مریضہ کیلئے تخلیہ ہو گیا یہاں پر یہ سوال نہ کیا جا سکے گا کہ غیر مرد کی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی کیوں؟ یہ تو شرعاً ناجائز ہے کہ یہ پیر مرد بالکل نحیف تھے کمزور تھے ایسے شخص کیلئے شرعی طور پر گنجائش مل جاتی ہے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ طبیب کو مریضہ کی تحقیق کیلئے تخلیہ کی گنجائش ہو سکتی ہے،

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ ہم سے کسی پہلی اُمت کا ہے جس کے قوانین میں یہ گنجائش ہو۔

نرم نرمک گفت شہر تو کجاست

کہ علاج اہل ہر شہرے جدا ست

طبیب نے مریضہ کنیزک سے پوچھا تیرا شہر کون سا ہے کہ ہر شہر والے کا علاج حسب اختلاف مزاج ہوتا ہے، طبیب نے وطن پوچھا کہ مریضہ کھل کر بات کرے اور کسی قسم کا حجاب نہ رکھے، طبیب نے مریضہ سے وطن ملک پوچھا یہ اسی غرض سے تھا کہ وہ کسی قسم کا گمان نہ کرے بلکہ تحقیق کیلئے بات کھول کر بتا دے، طبیب نے نرم نرم الفاظ میں کہا بتا تیرا شہر کونسا ہے کہ ہر شہر والے کا علاج مزاج کے مطابق ہوتا ہے۔

وندراں شہر از قرابت کیستت

خویشی و پیوستگی با چیستت

اس شعر میں بھی مریضہ سے تحقیق مطلوب ہے کہ بتا اس شہر میں تیرے کون کون سے رشتہ دار ہیں، متعلقین میں اور کن لوگوں سے تیرا میل ملاپ نشست و برخاست ہے، طبیب چاہتا تھا کہ اس کی بیماری کی صحیح صورت حال معلوم ہو جائے۔

دست بر نبضش نہاد و یک بہ یک

باز مے پرسد از جورِ فلک

طبیب نبض پر ہاتھ رکھتا اور پوچھتا تھا کہ تجھ پر آسمانی ظلم کیا ہوا، آسمانی ظلم کا

ذکر محض شعر و اشعاری کے پیش نظر ہے ورنہ آسمان سے شکوہ زمانہ کو برا بھلا کہنا شرعی طور پر درست نہیں جیسے حضور ﷺ نے فرمایا اللہ فرماتا ہے کہ بندہ زمانہ کو برا کہہ کر مجھے تکلیف دیتا ہے کہ زمانہ کا تبدل و تغیر میرے ہاتھ میں ہے، بریں بنا آسمان کا شکوہ کرنا اچھا نہیں۔

چوں کسے را خار در پایش خلد

پائے خود را بر سر زانو نہد

فرماتے ہیں جب کسی کے پیر میں کانٹا چبھتا ہے تو وہ اپنے پیر کو گھٹنے پر رکھ لیتا ہے۔

از سر سوزن ہمی جوید سرش

در نیابدمے کند بالب ترش

کانٹا چبھنے کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں کہ کانٹا چبھنے کے بعد کانٹے کا سر سوئی کی نوک سے تلاش کرتا ہے اور اگر نہیں ملتا تو اُسے لب سے تر کرتا ہے فرماتے ہیں پیر کا کانٹا جب اس قدر دشوار ہے تو پھر دل میں عشق و محبت کا کانٹا چبھ جائے تو سالک کا کیسا حال ہوگا، ان اشعار میں فرماتے ہیں جب پاؤں کانٹا چبھ جائے تو کس قدر پریشانی ہوتی ہے، سوئی کی نوک سے تلاش کرتا ہے لب لگاتا ہے جب ظاہری کانٹا دشواری سے ملتا ہے تو دل کے کانٹا کا کیا حال ہوگا۔

یہ مثال طبیب موصوف نے کنیز کی تحقیق حالات میں بیان کی ہے جب پاؤں میں چبھا کانٹا تلاش کرنا مشکل ہے تو دل میں چبھا ہوا کانٹا کس قدر مشکل ہوگا۔

خار در پاشد چنیں دشوار یاب
خار در دل چوں بود دادہ جواب

پاؤں میں چبھا کانٹا کی تلاش کرنا مشکل ہے تو دل میں عشق ومحبت کا چبھا کانٹا تلاش کرنا کس قدر مشکل ہوگا۔

خار دل را گر بدیدے ہر خسے
کے غماں را دست بودے بر کتے

فرماتے ہیں دل کے کانٹا کو اگر ہر آدمی دیکھ سکتا تو غموں کا کس پر کب قابو چل سکتا، اس شعر کا خلاصہ یہ فرماتے ہیں اگر ہر کس وناکس ادنیٰ واعلیٰ پڑھا ان پڑھ ماہر امراض ہونے کی حیثیت رکھتا اور دلوں کی بیماریوں کا معالج ہوتا تو کسی کو بھی روحانی تکلیف نہ ہوتی، آج ہم دیکھتے ہیں بہت سے افراد جو اپنے مشائخ سے قلبی تعلق رکھتے ہیں، روحانی شفا سے محروم ہیں، مولانا کا اشارہ اس طرف ہے کہ روح کی صفائی دل کے تزکیہ حالات کی بہتری کیلئے کسی کامل شیخ سے استفادہ ضروری ہے، ناقص راہنمائی محض تباہی ہوگی۔ اس عنوان پر یہ مصرعہ جاندار نظر آتا ہے۔

عقل اگر داری مکن کسب کمال از ناقصاں
کے رسد آخر دماغت از شراب نیمرس

اگر تو عقل وفکر کا مالک ہے تو ناقص راہنماؤں سے کمال حاصل کرنے کی اُمید نہ رکھ، اگر دل کا کانٹا معلوم کرنا ہر کسی کو سمجھ آجاتا تو کسی پر غم نہ آنے پر بندہ معلوم کر کے حل تلاش کر لیتا۔ اس میں اشارہ ہے امراض نفسانیہ کے علاج کیلئے کسی شیخ

کامل سے رجوع کرنا چاہئے۔

کس بزیر دُم خرّ خارے نہد
خرنداند دفعِ او برمے جہد

پہلے شعر کی تائید میں فرماتے ہیں اگر کوئی شریر آدمی گدھے کی دم کے نیچے کانٹا رکھ دیتا ہے تو گدھا اس کانٹے کو نکالنے کی ہمت تو نہیں رکھتا البتہ کود پڑتا ہے اب ہوتا کیا؟

خرز بہر دفع خاراز سوزو درد
جفتہ مے انداخت صد جا زخم کرد

گدھا اس تکلیف دور کرنے کیلئے کچھ اور تو کر سکتا نہیں، نہ کانٹا نکال سکتا ہے نہ اسے دیکھ سکتا ہے کرتا یہ ہے کہ دولتیاں مارتا ہے اور کئی جگہوں پر زخم کر دیتا ہے۔

آن لکد کے دفع خار او کند
حاذقے باید کہ بر مرکز تند

گدھے کی وہ دولتی اس کا کانٹا نہیں نکال سکتی ادھر ادھر زخم تو کر دیتی ہے مگر کانٹا نکالنے کی صورت پیدا نہیں کر سکتی، اس کانٹے نکالنے کیلئے کوئی سمجھدار بندہ چاہئے جو کانٹے کی جگہ کو سمجھے۔

بر جہد واں خار محکم ترکند
عاقلے باید کہ خارے بر کند

پہلے شعر کی تائید میں فرماتے ہیں کہ گدھا کودتا ہے بھاگتا ہے اور اپنے پر لگائے گئے کانٹے کو اور مضبوط کر دیتا ہے اس صورت حال پر قابو پانے کیلئے کوئی عقل مند چاہے جو کانٹا نکال دے۔ پہلے شعر کی تائید ہے کہ گدھا کانٹا نکالنا جانتا تو ہے، لیکن اچھل کود کر اُسے اور مضبوط کر لیتا ہے، اور جگہ جگہ زخم کر لیتا ہے اس کا لاتوں کو چلانا کانٹے کو کب نکال سکتا ہے، کانٹا نکالنے کیلئے کسی عقل مند کی ضرورت ہے۔

آں حکیم خارچین استاد بود
دست میزد جا بجا مے آزمود

اس سے پہلے اشعار میں مرض عشق کی مشکلات کا ذکر کیا تھا اور گدھے کی مثال دے کر بتایا تھا کہ نفس شیطان کس طرح روحانی بیماریوں کے کانٹے دل میں لگاتا ہے اور کم عقل مریض اپنی کم عقلی سے نقصان اُٹھاتا ہے پھر فرمایا تھا کہ ان کانٹوں کو نکالنے کیلئے کسی کامل حکیم کا وجود ضروری ہے اس شعر میں فرمایا وہ کانٹے نکالنے والا حکیم بھی ماہر تھا اور وہ جا بجا ٹٹولتا اور آزماتا تھا۔

زاں کنیزک بر طریق داستاں
باز مے پرسید حال دستاں

اس شعر میں بتایا گیا ہے وہ ماہر حاذق حکیم لونڈی سے سیدھے سادھے واقعات کا حال پوچھتا جاتا تھا، وہ حکیم دل کے کانٹے نکالنے کے ماہر تھے۔نبض کے مختلف مقامات پر ہاتھ بدلتے جاتے تھے اور مرض کا امتحان اور تشخیص کر رہے تھے اور اس کنیز سے راستبازوں کے طور پر سوالات کر رہے تھے اور وہ حکیم کو تمام باتیں صاف

صاف بتا رہی تھی وطن کا جال اور مالکوں کا حال کہ کہاں کہاں پہنچ گئی۔ اگلے شعر میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ وہ لونڈی بھی حکیم سے صاف صاف باتیں کر رہی تھی۔

با حکیم او رازہا میگفت فاش

از مقام و خواجگاں و شہر تاش

وہ کنیز بھی حکیم حاذق کے سامنے اپنے مقام، رہائش اور اپنے شہری لوگوں کے متعلق راز کی باتیں صاف صاف کہہ رہی تھی، اس بیمار کنیز نے اپنے حاذق حکیم کے سامنے اپنی کوئی بات چھپائی نہیں بلکہ واضح اور کھول کھول کر بیان کر دی۔

سوئے قصہ گفتنش میداد گوش

سوئے نبض و جستنش میداشت ہوش

اس شعر میں حکیم کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے کہ جب کنیز اپنے اندر کی ساری باتیں حکیم کو بتا رہی تھی تو اس وقت حکیم کی یہ کیفیت تھی کہ اس کی گفتگو کو بڑی توجہ سے کان لگا کر سن رہا تھا مریضہ کی باتیں بھی سن رہا تھا اور اس کی نبض کا بھی خیال رکھ رہا تھا۔

تا کہ نبض از نام کہ گردد جہاں

اُو بود مقصود جانش در جہاں

حکیم حاذق نے کنیز کی نبض کا خاص خیال رکھا کہ اسے پتہ چل جائے کہ کس شخص کے نام پر اس کی نبض حرکت میں آتی ہے، یہ نبض کی تیزی حرکت بتا دے گی کہ دنیا میں اس کا دلی یار وہی ہو گا جس پر نبض حرکت میں آتی ہے۔ حکیم نے نبض کی تیزی

سے سمجھ لیا کہ محبوب کے شہر سے جدا ہونا اس مرض کی شدت کا سبب ہے۔

چو زر بخور آں حکیم ایں راز یافت
اصل آں درد و بلا را بازیافت

حکیم حاذق نے مختلف سوال کر کے اس کی نبض کی تیزی سے مریضہ کا یہ راز معلوم کر لیا اور اس کی اصل مصیبت کو بھانپ گیا کہ یہ اور یہ دکھ اصل میں ہے کس کا۔

گفت کوئے او کدام است و گذر
او سرِ پل گفت و کوئے غاتفر

جس نام پر نبض پھڑکی تھی اور اس میں تیزی آ گئی تھی حکیم نے پوچھا اس کا کوچہ اور راستہ کون سا ہے، کنیز نے جواب دیا، راستہ کا نام سر پل ہے اور کوچہ غاتفر کے محلے کا ہے۔

گفت آنگہ آن حکیم با صواب
آن کنیزک را کہ رستی از عذاب

دانشور حکیم نے اس لونڈی سے کہا اب تو تکلیف سے بچ گئی ہے۔

گفت دانستم کہ رنجت چیست زود
در علاجت سحر ہا خواہم نمود

اس دانشمند طبیب نے کہا مجھے پتہ چل گیا ہے تمہیں کیا تکلیف ہے اب فوری طور پر تیرے علاج میں تدبیر کروں گا۔

شاد باش و ایمن و فارغ کہ من
آن کنم با تو چوں باراں با چمن

اس طبیب نے کنیزک سے کہا اب تو بے فکر ہو جا میں تیرے ساتھ ایسا طریقہ اختیار کروں گا جسے رحمت کا بادل باغ کے ساتھ کرتا ہے۔

من غم تو میخورم تو غم مخور
بر تو من مشفق نرم از صد پدر

طبیب نے لونڈی سے کہا اب تو پریشان نہ ہو میں تیرا غمخوار ہوں سو باپوں سے بڑھ کر تیرا ہمدرد ہوں یعنی جس قدر باپ میں شفقت و ہمدردی ہوتی ہے میں اس سے سوگنا زیادہ ہمدردی کروں گا۔

ہاں وہاں ایں راز را باکس مگوے
گرچہ شاہ از تو کند بس جستجو ے

حکیم حاذق نے کنیز سے کہا خبردار یہ راز کسی سے بتانا مت اگرچہ بادشاہ بھی تجھ سے مطالبہ کرے یہ راز نہ کھولنا۔

تاتوانی پیش کس مکشاء راز
بر کسے ایں در مکن زنہار باز

کسی کے پاس اپنا راز ظاہر نہ کرو کسی پر اپنے راز کا دروازہ مت کھولو۔

چونکہ اسرارت نہاں در دل شود
آن مرادت زود تر حاصل شود

پہلے شعر کی تائید میں فرماتے ہیں کہ جب تمہارے راز دل میں چھپے رہیں گے تو تمہاری وہ مراد جلد پوری ہو جائے گی۔ اس شعر میں راز کو مخفی رکھنے کی مزید تاکید کی جا رہی ہے کہ راز کھل جانے کے ساتھ کوئی نہ کوئی مشکل سامنے آ جاتی ہے جو مقصد پانے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

گفت پیغمبر ہر آنکو سرّ نہفت
زُود گردد با مراد خویش جفت

مولانا فرماتے ہیں حضور ﷺ کا ارشاد ہے جو شخص اپنا بھید چھپاتا ہے وہ جلد اپنی مراد کو پالیتا ہے۔ اس شعر میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے "استعینوا فی الحوائج بالکتمان" اپنی مرادیں پانے میں راز چھپانے سے مدد لو۔

دانہ چوں اندر زمیں پنہاں شود
بعد ازاں سرسبزی بُستان شود

راز چھپانے کی اہمیت کو ایک مثال دے کر بتایا جا رہا ہے کہ دیکھو دانہ زمین میں جب چھپ جاتا ہے تو اس کے بعد پودے کی شکل اختیار کر کے باغ کی زینت بنتا ہے۔

زرّ و نقرہ گر نبود ندے نہاں
پرورش کے یافتندے زیر کاں

دوسری مثال یوں فرماتے ہیں، سونا چاندی اگر مخفی نہ ہوتے تو کان کے اندر پرورش کیسے پاتے، مولانا نے دو مثالیں دے کر سمجھایا ہے کہ بیج زمین میں چھپتا ہے تو آخر ایک خوبصورت پودے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور باغ کی زینت بنتا ہے اگر یہ دانا زمین سے باہر رہتا تو باغ کیسے بنتا۔ اگر زمین کے بخارات کان سے باہر نکالے جاتے تو سونا چاندی نہ بن سکتے، اسی طرح راز کے بیج کو دل کے گلزار میں مخفی رکھیں اور رازوں کو دل کی کان میں دبائے رکھیں تو خوبصورت پھولوں کی شکل ہوں گے اور سونا چاندی ہوں گے۔

وعدہا باشد حقیقی دلپذیر
وعدہا باشد مجازی تاسہ گیر

اس شعر میں وعدوں کے بارے بتایا گیا ہے کہ سچے وعدے دل پسند ہوتے ہیں اور بناوٹی وعدے دل کو بے قرار کر دیتے ہیں مولانا نے اپنے اس شعر میں حضور ﷺ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امام حسن فرماتے ہیں میں نے حضور ﷺ سے یہ کلمات سن کر یاد کر لئے "دع ما یریبك الی مالا یریبك ان الصدق طمأنية وان الكذب ريبه او كما قال النبی ﷺ "شک کی بات چھوڑ دے غیر شکی بات اختیار کر، سچائی دل کا اطمینان ہے اور جھوٹ شبہ کی بات ہے۔

وعدۂ اہل کرم گنج رواں
وعدۂ نااہل شد رنج رواں

فرماتے ہیں اہل کرم کا وعدہ خزانہ ہے جس کا فیض ہمیشہ رہے گا، نالائق کا وعدہ جان کی مصیبت ہے ان دونوں اشعار میں مولانا نے شیخ کامل اور غیر کامل کے وعدوں کا ذکر کیا ہے۔ شیخ کامل کے وعدے کسی شے سے بھی متعلق ہوں سب سچے ہوتے ہیں اور دل کا اطمینان بنتے ہیں مگر غیر کامل ریا کار کے وعدے جھوٹے ہوتے ہیں جو پورے نہیں ہوتے اور دل کی پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔

وعدہا باید وفا کردن تمام
ورنخواہی کرد باشی سرد و خام

فرماتے ہیں تمام وعدوں کو پورا کرنا چاہیئے، اگر تم پورے نہ کرو گے تو غلط کار ثابت ہو گے سرد خام ہو گے، وعدہ خلاف آدمی کو سرد مہر یا سرد خام اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں صداقت قائم رکھنے کی سرگرمی نہیں ہوتی۔ اس کا کام جاتا رہتا ہے، اس میں پختگی نہیں ہوتی، عہد کا پورا کرنا انبیاء علیہم السلام کا شیوہ ہے اور پیغمبروں کے حالات میں وعدہ وفائی کے بہت سے واقعات ملتے ہیں اس سلسلہ میں حضور ﷺ کا ارشاد گرامی اس طرح ملتا ہے، ''لا تعده مودة فتخلفه او کما قال ﷺ '' اپنے بھائی سے کوئی ایسا وعدہ نہ کر کہ اس کے خلاف کرے۔

وعدہ کردن را وفا باشد بجان
تا بہ بینی در قیامت فیض آن

فرماتے ہیں وعدہ کو پورا کرنا دل و جان سے واجب ہے تا کہ تو قیامت کے دن اپنے وعدہ وفا کا فیض دیکھ سکے۔

آں حکیم مہرباں چوں راز یافت
صورت رنج کنیزک باز یافت

اس مہربان حکیم نے جب یہ راز معلوم کر لیا تو کنیزک کے دکھ کا پتہ کر لیا۔

بعد ازاں برخاست عزم شاہ کرد
شاہ راز آں شمہ آگاہ کرد

اسی طبیب نے بادشاہ کو کنیزک کی صحیح صورت حال بیان نہ کی کہ اس حقیقت کھولنے سے بادشاہ کو تکلیف ہوگی کہ اس کی محبوبہ کسی غیر مرد پر عاشق ہے، طبیب نے بادشاہ کو تکلیف پہنچانا مناسب نہ جانا بس اتنا کہہ دیا کہ مریضہ ایک دماغی عارضہ میں مبتلا ہے، جس کا سبب ایک شخص سمرقند کا باشندہ ہے۔

شاہ گفت اکنوں بگو تدبیر چیست
در چنیں غم موجب تاخیر چیست

بادشاہ نے کہا اب بتاؤ تدبیر کیا ہے اس قسم کی پریشانی میں دیر کیوں کی جا رہی ہے۔

گفت تدبیر آں بود کاں مرورا
حاضر آریم از پئے ایں درد را

بادشاہ کے اس سوال پر کہ اس کا حل کیا ہے، طبیب نے بتایا اس کا حل یہ ہے کہ اس درد کے علاج کیلئے اس زرگر آدمی کو حاضر کریں، طبیب نے غیرت عشق کی وجہ سے یہ راز نہ کھولا کہ وہ زرگر شخص علاج خود کرے گا یا کسی کو دے گا۔

قاصد بفرست کاخبارش کند
طالب ایں فضل و ایثارش کند

زرگر کی طرف کوئی قاصد بھیجئے تا کہ اس کو بتائے تجھے بادشاہ بلا رہا ہے اور اُسے بادشاہ کی طرف سے انعام کا احساس دلائے اکثر بادشاہ کا یاد کرنا زرگر کیلئے بڑی بات تھی اور اس کی خوش نصیبی تھی۔

مرد زرگر را بخواں زاں شہر دور
باز رو خلعت بدہ اُو را غرور

اس مرد زرگر کو اس کے لمبے سفر سے بلائیے نقدی اور لباس کے انعام سے اُسے قریب کیجئے۔

تاشود محبوب تو خوشدل بدو
گرد آساں ایں ہمہ مشکل بدو

تا کہ آپ کی محبوبہ کا دل اُس کے آنے سے خوش ہو جائے اور یہ ساری

مصیبت اس کی وجہ سے حل ہو جائے۔اس طبیب الٰہی نے اب بھی بات راز میں رکھی ہے اور بات واضح کرنا پسند نہ کیا۔

چوں بہ بیند سیم و زر آں بے نوا
بہر زر گردد زخان و ماں جدا

جب وہ تنگدست زرگر سونا چاندی دیکھے گا تو اس دولت کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑنا پسند کرے گا۔

زر خرد را والہ و شیدا کند
خاصہ مفلس را کہ خوش رسوا کند

مال و دولت بندے کو دیوانہ کر دیتے ہیں خاص کر کے غریب کو تو خوب رسوا کرتا ہے فرمایا جا رہا ہے مال و دولت کی حرص ہر شخص کو اپنی طرف کھینچتی ہے مگر غریب کو تو بالکل اندھا بنا دیتی ہے۔

زر اگرچہ عقل مے آردو لیک
مرد عاقل باید او را نیک نیک

فرماتے ہیں مال اگرچہ عقل پیدا کرتا ہے مگر اس کیلئے نیک اور عقل مند بندہ چاہئے۔

چونکہ سلطان از حکیم آں را شنید
پند او را از دل داز جان گزید

بادشاہ نے جب حکیم سے یہ باتیں سنیں تو اس کی ہدایت نصیحت کو دل سے مان لیا۔

گفت فرمان ترا فرماں کنم
ہر چہ گوئی آنچناں کن آں کنم

بادشاہ نے حکیم سے کہا تیرے فیصلے کے مطابق حکم دوں گا اور تیری ہدایت کے مطابق ہی کروں گا۔

پس فرستاد آں طرف یک دو رسول
حاذقانِ و کافیان و بس عدول

بادشاہ نے اس طرف ایک دو عقل مند ہوشیار قاصد بھیجے جو قابل اعتبار تھے۔

تا ثمر قند آمدند آں دو امیر
پیش آن زرگر زشاہنشاہ بشیر

وہ دونوں قاصد پیغام لانے والے بادشاہ کی طرف سے زرگر کے پاس سمرقند خوشخبری لے کر آئے۔اس شعر میں مولانا کی شخصیت پر ایک سوال کیا گیا ہے کہ آپ نے بادشاہ کو بادشاہوں کا بادشاہ کہا ہے۔حدیث شریف میں تو ہے اس لقب کو اچھا نہیں فرمایا، مشکوٰۃ شریف میں ہے قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کا نام شہنشاہ رکھا گیا کہ بادشاہوں کا بادشاہ اللہ کے بغیر کوئی نہیں ''لا ملك الا اللّٰہ'' بادشاہ اللہ ہی ہے، بعض نے اس کا جواب دیا ہوسکتا ہے مولانا کی نظر سے یہ حدیث نہ گزری ہو مگر اس سے زیادہ اچھا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے ضرورت شعری کے پیش نظر یہ کہہ دیا گیا ہو۔

کاے لطیف استاد کامل معرفت
فاش اندر شہرہا از تو صفت

اس شعر میں مولانا نے استاذ کی تعریف کی ہے فرماتے ہیں اے باریک کام کرنے والے استاذ پوری شناخت والے جس کی تعریف شہروں میں عام ہے۔

نِک فلاں شہ از برائے زر گری
اختیارات کرد زیر امہتری

(ان دو قاصدوں نے زرگر سے کہا) اس وقت فلاں بادشاہ نے تجھ کو خاص شاہی زیور بنانے کیلئے پسند کیا ہے کہ تو اس صنعت میں ماہر ہے کامیاب ہے اور بلند درجہ کا مالک ہے۔

اینک ایں خلعت بگیرد زر و سیم
چوں بیائی خاص باشی و ندیم

(پیغام پہنچانے والوں نے کہا) سر دست یہ لباس اور دولت لے پھر جب تو بادشاہ کے حضور آئے گا تو تجھے درباری کا درجہ مل جائے گا اور بادشاہ کا ہم نشین ہوگا۔

مرد مال و خلعت بسیار دید
غرّہ شد از شہر و فرزنداں برید

وہ زرگر بہت سا مال دیکھ کر فریفتہ ہو گیا اور اس نے اپنے وطن اور خاندان سے تعلق توڑ لیا۔

اندر آمد شادماں در راہ مرد

بے خبر کاں شاہ قصدِ جانش کرد

زرگر تو بہت خوشی اور مستی میں رہا اُسے یہ پتہ نہ تھا کہ بادشاہ تو اس کی جان لینا چاہتا ہے۔ زرگر کی جان لینے کا قصد تو دراصل طبیب الٰہی نے ہی کیا تھا ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کو ابھی تک اس حیلہ اس تدبیر کی خبر ہی نہ ہو چونکہ ساری کارروائی کا مرکزی پہلو تو بادشاہ ہی ہے اسی لئے زرگر کے قتل کو اسی سے منسوب کیا گیا ہے۔

اسپ تازی بر نشست و شاد تاخت

خونبہائے خویش را خلعت شناخت

وہ زرگر عربی گھوڑے پر سوار ہو کر خوشی خوشی چلا اور غلطی سے اپنے خون بہا کو جو لباس کی صورت میں اُسے ملا تھا ایک انعامی لباس سمجھ لیا۔ اس شعر میں مولانا نے مثال دے کر سمجھایا ہے کہ یہی حال اس غافل آدمی کا ہے جو دنیاوی لذتوں میں پھنس کر گناہوں میں مبتلا ہو گیا اور زندگی برباد کر بیٹھا۔

اے شدہ اندر سفر با صد رضا

خود بپاپے خویش تا سوء القضاء

اس شعر میں حضرت مولانا نے مخاطب سے فرمایا ہے کہ تو بڑی خوشی سے اپنے ہی پاؤں سے سخت موت اور برے حالات کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس شعر میں ایک حدیث شریف کی ترجمانی ہے جس میں حضور ﷺ فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کسی

بندے کے متعلق یہ فیصلہ فرماتا ہے کہ وہ کس جگہ جا کر وفات پائے تو پھر اس کے وہاں جانے کیلئے کوئی ضرورت پیدا کر دیتا ہے اور وہ وہاں پہنچ کر فوت ہوتا ہے۔اس عنوان کو شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

کبوتر یکہ دگر آشیاں نخواہد دید
قضا ہمے برد او را بسوئے دانہ دوام

در خیالش ملک و عز و سروری
گفت عزرائیل رو آرے بری

اس کے خیال میں بادشاہی کا دھن آ چکا تھا تو عزرائیل نے اسے کہا جاؤ وہاں سے سب کچھ مل جائے گا۔حضرت مولانا نے یہ مثال دے کر اس زرگر کی حالت پر تبصرہ کیا ہے کہ وہ زرگر اپنے خیالات میں پھنسا ہوا تھا، بادشاہی کی تمنا حکومت کی ہمنشینی کا تصور اس پر سوار ہو چکا تھا اور اس کی بدقسمتی اس سے مذاق کر رہی تھی۔

چوں رسید از راہ آں مرد غریب
اندر آوردش بہ پیش شہ طبیب

اس شعر میں غریب زرگر کی بادشاہ کے ہاں آمد کا ذکر کیا گیا ہے، جب وہ غریب آدمی سفر کر کے وہاں پہنچا اور طبیب نے اس کو بادشاہ کے پیش کیا۔

پیش شاہنشاہ بروش خود بناز
تا بسوزد بر سر شمع طراز

طبیب اس زرگر کونہایت نازاور خوشی کے ساتھ بادشاہ کے پاس لے گیا تا کہ اس کو کنیز پر چراغ کی طرح جلائے ، اس شعر میں عام لوگوں کے انداز کا ذکر کیا گیا ہے کہ جیسے بعض توہم پرست لوگ بیمار کے سرہانے چراغ جلا کر علاج کرتے ہیں ، ایسے ہی طبیب نے بھی زرگر کو بادشاہ کے حضور پیش کیا۔

شاہ دید اورا و بس تعظیم کرد
مخزن زر رابدو تسلیم کرد

بادشاہ نے جونہی زرگر کو دیکھا تو اس کی بڑی تعظیم کی اور سونے کا ذخیرہ اس کے سپرد کر دیا۔

پس بفرمودش کہ برسازد زِزر
از سوار و طوق و خلخال و کمر

زرگر کو انعامات دینے اور اس کی تعظیم کرنے کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ سونے کے کنگن گلے کا ہار، پاؤں کی جھانجر کمر بند بنائے۔

ہم ز انواع اوانی بے عدد
کانچناں در بزم شاہنشہ سزد

اس زرگر نے کئی طرح کے برتن بھی بنائے جیسے بیاہ شادی کے موقعہ پر بنائے جاتے ہیں ہوسکتا ہے یہ سونے چاندی کے برتن محض زیبائش کیلئے ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بادشاہ نے ایسا حکم اس لئے دیا ہو کہ پہلی امتوں میں سونے چاندی کے

برتنوں میں کھانا پینا جائز ہوگا۔ فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ تکبر فخر کے طور پر نہ ہو محض گھر کو سجانے کیلئے ایسا ہو تو حرج نہیں۔

زر گرفت آں مرد و شد مشغول کار
بے خبر از حالت ایں کار زار

اس زرگر نے سونا لے لیا اور کام میں لگ گیا وہ اس کام کی خراب حالت سے باخبر تھا

پس حکیمش گفت کاے سلطان مہ
آن کنیزک را بایں خواجہ بدہ

اس شعر میں اس سارے معاملہ کا لُب لباب بتاتے ہیں کہ پھر اس بادشاہ کو حکیم نے کہا یہ کنیزک اس صاحب کو دید یجئے کہ اس سے نکاح کر دیجئے، اس کنیز کی بیماری کا علاج اس زرگر سے وصل ہی تھا۔

تا کنیزک در وصالش خوش شود
آب وصلش دفع ایں آتش نور

تا کہ یہ کنیز زرگر سے مل کر خوش ہو جائے اور اس زرگر کے وصل کا پانی عشق کی آگ کا علاج ہو جائے۔ لمبا ہجر عاشق کے عشق کی زیادتی کا سبب بنتا ہے اس لئے اللہ والے لوگ لمبے ہجر میں آہ و بکا کا مزہ لیتے ہیں۔ اس عنوان کو کسی شاعر نے اس طرح پیش کیا جو دل لگتا ہے۔

حیف وہ سائل کہ کچھ دے کر جسے رخصت کیا
وائے وہ نالہ صلہ جس کو ملا تاثیر کا

مدت ششماہ میراندند کام
تا بصحت آمد آں دختر تمام

آخر کار بادشاہ نے وہ خوبرو کنیز اس زرگر کو دے دی اور اُن دو طالبان کا نکاح کر دیا۔ بادشاہ کو اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا اپنے دل پر پتھر رکھ کر اپنی محبوبہ کو زرگر کے نکاح میں دے دیا شائد بادشاہ نے بھی سمجھا ہو گا کہ عافیت اسی میں ہے، کنیزک کا نکاح زرگر سے کر دیا جائے جیسے کوئی جلدی میں غلط کام کر بیٹھے اور پھر پیچھے سوچ سمجھ کے پچھتا تا رہے۔

بعد ازاں از بہر او شربت بسافت
تا بخورد و پیش دختر میگذاشت

دونوں کے نکاح کے بعد حکیم نے اس زرگر کیلئے ایک زہریلی قسم کا شربت بنایا جسے پی کر وہ زرگر لڑکی کے سامنے دن بدن کمزور ہونے لگا یہ بات حکیم کے علم میں تھی کہ ان کے آپس میں تعلقات محبت کو ختم کرنے کیلئے محبوب کی صورت بگاڑ دی جائے اس زہریلے شربت سے زرگر کی صورت خراب ہونے لگی۔

چوں ز رنجوری جمال او نماند
جانِ دختر در وبال او نماند

جب اس زہریلے شربت کی وجہ سے زرگر کا چہرہ بدل گیا اور بیماری کے اثرات نمایاں ہو گئے تو لڑکی کی جان بھی اس کے عشق کی مصیبت میں نہ رہی۔

چونکہ زشت و ناخوش و رخ زرد شد
اندک اندک در دل او سرد شد

مولانا فرماتے ہیں اس زہریلی شربت کا اثر یہ ہوا کہ وہ زرگر بدصورت ہو گیا ،اس کا پہلا حسن جواب دے گیا تو آہستہ آہستہ اس کنیزک کے دل سے بھی وہ اتر گیا، عشق ٹھنڈا پڑ گیا، چونکہ وہ عشق سچا نہ تھا محض صورت پرستی تھی ،اس لئے ایسا ہو گیا کسی بھی سچے عشق کی یہ صورت نہیں ہوتی وہ صورت کا محتاج نہیں ہوتا ،شکل کا گرویدہ نہیں ہوتا اس پر کسی قسم کی غلط دوا کا اثر نہیں ہوتا۔

عشقہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

اس شعر میں مولانا سچے اور جھوٹے عشق کی صورت کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں جو عشق محض رنگ و روپ کی وجہ سے ہوتا ہے وہ سچا عشق نہیں ہوتا آخر کار وہ عشق شرم اور پریشانی کا سبب بنتا ہے،فرماتے ہیں وہ عشق جو محض شکل وصورت سے تعلق رکھتا ہے وہ سچا عشق نہیں مضبوط نہیں جب وہ رنگ و روپ ختم ہو گا تو عشق بھی ساتھ ہی ختم ہو جائے

گا اور بغیر شرم افسوس کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

کاشکے آں ننگ بودے یکسری
تا نرفتے بروے آں بد داوری

فرماتے ہیں کاش اُس لونڈی کا عشق پائیدار ہوتا، حقیقی ہوتا، مجازی نہ ہوتا تو عشق کے نام پر دھبہ نہ لگتا مطلب یہ ہوگا کہ یہ عشق باوجود ننگ انسانیت ہونے کے زرگر کی موت پر زائل ہو جانے والا نہ سمجھا جاتا تا کہ زرگر کو مارنے کی یہ تدبیر نہ کی جاتی تو پھر کنیز کی سلامتی کیلئے زرگر کی سلامتی بھی مطلوب ہوتی۔

خون دوید از چشم ہمچوں جوئے اُو
دشمن جان وَے آمد روئے او

فرماتے ہیں زرگر کو زہریلا شربت پلانے سے اس کی آنکھوں سے نہر کی طرح خون بہنے لگا، اس زرگر کی خوبصورتی اس کی ہلاکت کا سبب بنی، بدصورت ہوتا تو کنیز اس پر فریفتہ کیوں ہوتی اور بادشاہ اس کو ہلاک کرواتا۔

دشمن طاؤس آمد پرّ اُو
اے بسا شہ را بکشتہ فرّ اُو

مثال دے کر عشق کے اس کارنامے کو کمزور بے اصل ثابت کر رہے ہیں فرماتے ہیں، مور کا دشمن خود اس کا پر ہوتا ہے مور کے پروں کی خوبصورتی خود اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے، بادشاہ کی عظمت اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے، جب

دوسرا بادشاہ اس پر حسد کرے تو یہی عظمت ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔

چونکہ زرگر از مرض بد حال شد
در گدازش شخص او چو نال شد

فرماتے ہیں جب یہ زرگر اپنی بیماری سے بری حالت کو پہنچ گیا اور اُس کا جسم گھُل جانے کی وجہ سے لاغری میں قلم کا سا ہو گیا۔

گفت من آں آہوم کز ناف من
ریخت آں صیّاد خون صاف من

فرماتے ہیں تو اس نے کہا میں وہ ہرن ہوں جس کی ناف سے شکاری قاتل نے صاف خون گرا دیا، اس کے کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ زرگر اپنی بے بسی مظلومی پر رو رہا ہے۔

اے من آں رُوباہِ صحرا کز کمیں
سر برید ندم برائے پوستیں

یہی زرگر اپنی حالت کو دوسرے انداز میں اس طرح بیان کر رہا ہے میں جنگل کی وہ لومڑی ہوں کہ پوستین کی غرض سے شکاریوں نے کمین گاہ سے اُٹھ کر میرا سر کاٹ دیا۔

اے من آن پیلے کہ زخم پیلباں
ریخت خونم از برائے استخواں

اپنی حالت ایک تیسری صورت میں اس طرح پیش کیا کہ میں وہ ہاتھی ہوں کہ فیلبان کے زخم نے میری ہڈی کی خاطر مجھ کو ہلاک کیا۔

آنکہ کشتم پئے ماؤون من

مے نداند کہ نخسپد خون من

فرماتے ہیں جس شخص نے مجھ سے گھٹیا درجہ (بادشاہ) کی وجہ سے مجھ کو ہلاک کیا اُسے یہ پتہ نہیں کہ میرا خون برباد نہیں جائے گا بلکہ بدلہ لے گا۔ زرگر اپنے آپ کو کبھی ہرن سے کبھی لومڑی سے کبھی ہاتھی سے تشبیہ دے کر اپنے قاتل کو کوس رہا ہے یہاں تک کہ بادشاہ کو بھی اپنے سے کم درجہ کا خیال کر رہا ہے، شاید اس وجہ سے کہ میں کنیزک کا معشوق ہوں اور بادشاہ عاشق ہے یا ویسے ہی کہے جا رہا ہے غرض یہ ہے کہ آخر وقت تک صبر و شکر حوصلہ ہمت کی بات اس کی زبان پر نہیں آئی، یہ اس کی ساری باتیں کبر و غرور اکڑ بازی ہی دکھائی دیتی ہیں۔

بر من ست امروز و فردا بروئے است

خون چوں من کس چنیں ضائع کے است

اس شعر میں زرگر پھر وہی بات دہراتا ہے اگر آج مصیبت مجھ پر آئی ہے تو کل کو اس پر بھی آئے گی پھر وہی تکبر کی بات کرتا ہے کہ مجھ جیسے عظیم انسان کا خون ضائع نہیں ہو سکتا۔ اس شعر میں بھی زرگر کا وہی انداز مغرورانہ ہے جو ختم نہیں ہوا بلکہ طبیب پر اپنی کسمپرسی کا انجام دیکھنا چاہتا ہے۔

گرچہ دویار افگند سایہ دراز

باز گردد سوئے او آں سایہ باز

اس شعر میں بھی پہلے نظریہ کو دہرایا جا رہا ہے زرگر نے جو کہا تھا جو کچھ آج میرے ساتھ ہو رہا ہے کل کو بادشاہ کے ساتھ ہوگا کہتا ہے جو دیوار اگر چہ سایہ لمبا ڈالتی ہے مگر سایہ پھر اس کی طرف واپس آجاتا ہے۔ مولانا تمثیل کے طور پر فرماتے ہیں طلوع آفتاب کے وقت ہر چیز اپنا سایہ دور ڈالتی ہے مگر جیسے سورج بلند ہوتا جاتا ہے وہی سایہ قریب آتا ہے، زوال کے وقت بالکل اس دیوار یا کسی اور شے کے ساتھ مل جاتا ہے، فرماتے ہیں ایسے ہی مثال ہے اعمال کی کہ بالآخر ان کی جزا سزا عمل والے کو مل جاتی ہے۔

ایں جہاں کوہ است و فعل ماندا

سوئے ما آید ندا ہا را صدا

مولانا نے اس شعر میں اپنے اعمال کی جزا اور سزا کی مثال دی ہے جو کوئی جو کچھ کرتا ہے اُسے اس کی جزا سزا مل جاتی ہے، پہاڑ کی مثال فرماتے ہیں جب ہم آواز دیتے ہیں تو ہماری ندا کی گونج ہماری طرف آتی ہے ایسے ہی اعمال کی جزا سزا ہے جو ہمیں ملتی ہے اسی عنوان پر کسی نے شعر اچھا کہا ہے۔

بد نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

ایں بگفت و رفت در دم زیر خاک
آں کنیزک شد ز درد و رنج پاک

زرگر کی باتوں کا ذکر ہو رہا تھا، زرگر نے اتنی گفتگو کی اور مر گیا، خاک کے نیچے چلا گیا اور وہ کنیز بھی اس کے عشق کے دکھ سے نجات پا گئی، اس شعر سے اوپر کے دو شعر مولانا کا مقولہ ہیں باقی سارے اشارے زرگر کی طرف سے ہیں۔

زانکہ عشق مرد گاں پائندہ نیست
زانکہ مردہ سوئے ما آئیدہ نیست

فرماتے ہیں مرنے والے کا عشق مضبوط نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ مردہ ہمارے پاس آنے والا نہیں، اس سے پہلے شعر میں فرمایا تھا کہ زرگر کے مرنے پر کنیزک عشق کی بیماری سے نجات پا گئی عشق تو ایک بلند مقام شے ہے۔

پھر کنیز اس سے محروم کیوں ہو گئی چونکہ کنیزک کا محبوب فانی تھا اس کا عشق بھی عارضی اور فانی ہی ٹھہرا جو مرنے کے بعد زائل ہو گیا ہاں محبوب باقی ہی کا عشق باقی ہے جو پائیدار ہے جس کو عشق حقیقی کہتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ فانی شے کا عشق ناپائیدار کیوں ہے؟ تو دوسرے مصرعہ میں اس کا جواب دے دیا گیا کہ مٹنے والی شے مٹ کر واپس نہیں آتی جب وہ شے فانی ہے تو اس کا عشق بھی فضول ہے۔

عشق زندہ در روان و در بصر
ہر دمے باشد زغنچہ تازہ تر

اس پہلے شعر میں فرمایا گیا تھا کہ کنیزک کا محبوب فانی تھا اسی بنا پر اس کا عشق بھی عارضی ہے فانی ہے۔اس شعر میں عشق حقیقی کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ عشق حقیقی رب قدوس جل مجدہ کا عشق ہی باقی ہے، ہر دم رہنے والا ہے فانی نہیں، وہی عشق ہر لمحہ جان میں اور بینائی میں غنچہ سے بڑھ کر تازگی دیتا ہے۔ معشوق حقیقی جو حیّ ہے دائم ہے اس کا عشق بھی دائم ہے اس شعر میں مولانا نے عشق کو تازہ غنچہ سے مثال دی ہے، تازہ پھول پر بلبل کا عشق ہے مستی ہے ایک کیفیت ہے مگر جونہی یہ پھول مرجھائے گا بلبل کسی اور پھول پر چلی جائے گی پھول کے مرجھا جانے سے بلبل کا عشق ماند پڑ جاتا ہے مگر عشق حقیقی کا غنچہ کبھی مرجھاتا ہی نہیں اسی وجہ سے یہی عشق دائمی ہے ابدی ہے۔

عشق آں زندہ گزیں کو باقی است

وز شراب جانفزایت ساقی است

اس شعر میں حضرت مولانا عشق و محبت کے متوالے کو نصیحت فرما رہے ہیں، اے متوالے! معشوق حقیقی کا عشق اختیار کر، جو کبھی مرجھانے والا نہیں ہمیشہ سلامتی سے وابستہ ہے یہی عشق تجھے محبت و وارفتگی کی شراب سے سیراب کرے گا۔ مجازی عشق تیرے دل و دماغ کی ابتری کا سبب بنے گا یہی حقیقی عشق ہے جو تیری روح کو زندہ رکھے گا۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیاء

یافتند از عشق او کارو کیا

متوالے سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں تو بھی اسی حیّ و قیوم ذات ابدی کا عشق اختیار کر جس کے عشق سے تمام انبیاء علیہم السلام ممتاز ہوئے یہی عشق ہے جو انسان کو بلند مرتبہ سے نوازتا ہے مخلوق کا عشق اس مقام تک نہیں پہنچا سکتا بلکہ زار و رسوا کرتا ہے۔

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست
بر کریماں کار ہا دشوار نیست

اس شعر میں عشق و محبت کے متوالے کو نا اُمیدی سے روکا جا رہا ہے کہ وہ اپنے حیّ و قیوم رب قدوس سے بڑی عقیدت حوصلہ اُمید سے وابستہ رہے اور یہ نہ سمجھے کہ بادشاہ حقیقی تک پہنچنا بڑا مشکل ہے۔قرآن مقدس کے اس ارشاد کو ہمیشہ سامنے رکھے ''لا تائیسوا من رحمۃ اللہ '' اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو، حق پرست لوگ اس سے نا اُمید نہیں ہوتے اور اس عقیدہ کے ساتھ آگے بڑھے کہ وہ کریم ہے اور کریم پر کوئی کام مشکل نہیں تو کمزور انسان ہونے کی وجہ سے تو اس تک نہیں پہنچ سکتا مگر وہ تو قادر ہے کریم ہے حیّ ہے قیوم، چاہے تو تجھے اپنا بنا لے اس کے عشق و محبت کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے، اس میں داخل ہونے کیلئے حوصلہ اُمید ہمت کو ہمیشہ سامنے رکھے۔

کشتن آں مرد بر دستِ حکیم
نے پئے اُمید بود نے زبیم

اس کنیز، زرگر، بادشاہ کے واقعہ میں طبیب کا بھی ذکر آتا ہے، جو ولی اللہ تھا، یہاں پر ایک اشکال تھا کہ طبیب تو ولی اللہ تھا مگر بے گناہ زرگر کو قتل کرنا تو ولایت کے

درجہ کے منافی ہے، مولانا فرماتے ہیں اس قتل کے واقعہ ہونے کا اشارہ ایک غیبی تھا جس کی بنا پر طبیب یا بادشاہ کے دامن پر ظلم کا دھبہ نہیں لگ سکتا۔ فرماتے ہیں حکیم کے ہاتھ سے اس زرگر کا مارا جانا اس اُمید سے تھا کہ کنیز صحت یاب ہو جائے تو انعام ملے گا اور یہ خوف نہیں تھا کہ صحت یاب نہ ہوئی تو بادشاہ ناراض ہو جائے گا۔

او نکشتش از برائے طبع شاہ
تا نیامد امر و الہام از اِلٰہ

فرماتے ہیں زرگر کو اس حکیم نے بادشاہ کی خاطر قتل نہیں کیا تھا اس کے قتل میں خدائی الہام تھا۔

آں پسر را کش خضر ببرید حلق
سرّ آں را درنیابد عام خلق

اس زرگر کے قتل کو حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کی مثال دے کر بیان کیا ہے جس کا ذکر قرآن مقدس فرماتا ہے کہ آپ نے اس بچے کا گلا کاٹ دیا، عام مخلوق اس بھید کو نہ سمجھ سکی، اس شعر میں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ والوں کے بعض کام مخلوق کی عقل وفکر سے ورا ہوتے ہیں شریعت کے خلاف دکھائی دیتے ہیں مگر حقیقت میں اللہ کی رضا کے مطابق ہوتے ہیں، جیسے خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ایک بچے کو ہلاک کر دیا جب موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیوں کیا؟ تو فرمایا یہ بڑا ہو کر بدکار بننے والا تھا اور اس کے ماں باپ صالح و نیک ہیں۔ اسی وجہ سے اس کا قتل ہونا ہے اللہ اس کے ماں باپ کو اور بچہ عطا فرمائے گا۔

آنکہ از حق باید او وحی و خطاب
ہرچہ فرماید بُود عین صواب

فرماتے ہیں جس شخص کو خدا کی طرف سے وحی ہو وہ جو کچھ بھی کہے یا کرے عین حق ہوتا ہے، حضرت خضر علیہ السلام کے بچے کو ہلاک کرنے کا واقعہ ذکر کر کے طبیب الٰہی کے واقعہ کی تائید کی جارہی ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ طبیب نبی ہو، صورت جو بھی ہے فرمایا جارہا ہے کہ زرگر کا مارا جانا قدرت کے فیصلہ کے مطابق درست تھا۔

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رو است
نائب ست و دست او دست خدا ست

فرماتے ہیں وہ رب قدوس جل مجدہٗ جو زندگی بخشتا ہے اگر ہلاک بھی کر دے تو درست ہے اور اس کے حکم سے مارنے والا اس کا نائب ہے، اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے، جب حضور ﷺ صحابہ سے بیعت لے رہے تھے تو بارگاہ قدس سے حکم ہوا تھا محبوب جو تیرے ہاتھ میں بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں، خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔

ہمچوں اسماعیل پیشش سر بنہ
شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

فرماتے ہیں جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے کو قربانی کیلئے پیش کیا تھا اور راضی خوشی جان دینے کیلئے تیار ہو گئے تھے تجھے بھی چاہئے کہ اللہ کی رضا کیلئے

انہیں کی طرح کرے، اگر حق کا نائب تیرے قتل کرنے پر حق کی طرف سے ہو اور تیرا قتل اس کے نزدیک شرعاً جائز ہو تو تیرا اس کے آگے سر جھکانا قتل ہونا تیری ابدی زندگی ہے جو کمال کی انتہا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ذبح کرنے میں اختلاف ہوا ہے، یہود نے کہا وہ اسحاق تھے جمہور علماء محدثین کا اتفاق ہے وہ ذبح ہونے والے بیٹے سیدنا اسماعیل علیہ السلام تھے، یہود یہ پسند نہ کرتے تھے کہ اسماعیل علیہ السلام کے ذبح ہونے کو مان کر حضور ﷺ کو عظمت دی جائے قرآن مقدس کے اس واقعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نبی کی خواب بھی وحی ہوتی ہے۔

تابماند جانت خنداں تا ابد
ہمچو جانِ پاک احمدؐ با احد

اللہ کے حکموں کے تابع رہنے اور اس کی رضا پر لبیک کہنے کی اہمیت کو اس طرح واضح فرما رہے ہیں کہ نیک کاموں، ریاضات و مجاہدات سے ہمیشہ کیلئے تو ایسے خوش وخرم رہے گا جیسے احمد مجتبیٰ ﷺ اپنے رب قدوس احد کے ساتھ خوش وخرم ہیں۔

عاشقاں جام فرح آنگہ کشند
کہ بدست خویش خواہاں شاں کشند

اس شعر میں عشاق کے ایک بلند مقام کا ذکر فرما رہے ہیں کہ عاشق کمال محبت کا پیالہ اس وقت پیتے ہیں جب معشوق اُن کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتے ہیں۔ طالبان حق اس وقت مسرور ہوتے ہیں جب کامل شیوخ جوان کے محبوب ہیں انہیں ریاضت مجاہدہ میں مبتلا کر کے ان کے نفسانی تقاضوں کو فنا کر دیں۔

شاہ آں خواں از پئے شہوت نہ کرد
تو رہا کن بد گمانی و نبرد

اس شعر میں بادشاہ کے زرگر کو قتل کرانے پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ بادشاہ نے زرگر کو حسد کی بنا پر قتل کرایا تھا یا بادشاہ نے اُسے اپنی شہوت پرستی کے پیش نظر مروا دیا تھا ایسا خیال نہ کیا جائے اس لئے کہ بادشاہ تو ایک نیک آدمی تھا، اس پر ایسا گمان کرنا درست نہیں زندگی میں کئی ایسے واقعات پیش آتے ہیں ہم اس واقعہ کے ظاہر کو کچھ سمجھتے حقیقت میں ہوتا کچھ اور ہے۔

تو گماں کردی کہ کرد آلودگی
در صفا غش کے ہلد پالودگی

فرماتے ہیں تو نے یہ گمان کیا کہ زرگر کو قتل کر کے بادشاہ نے گناہ کیا تجھے پتہ ہونا چاہئے دل میں صفائی کھوٹ کو نہیں چھوڑتی، بادشاہ تو ایک اچھا شریف النفس آدمی تھا اس کی طبیعت میں ریاضات و عبادات نے کوئی اخلاقی جرم چھوڑا ہی نہیں تھا پھر اس کے متعلق اس قسم کا غلط خیال کرنا درست نہیں۔

بہر آن است ایں ریاضت ویں جفا
تا برارد کورہ از نقرہ جفا

فرماتے ہیں یہ عبادت و ریاضت اللہ اللہ کرنا اس لئے ہے کہ محنت کی بھٹی نفس کی چاندی سے خرابیوں کا میل دھو دے اور نفس کو پاک صاف کر دے۔

بہرِ آنست امتحانِ نیک و بد
تا بجوشد ، بر سر آرد زر زبد

پہلے شعر کی تائید میں بھی یہ دوسرا شعر ہے خالص اور ناخالص سونے کا امتحان بھی اسی لئے ہوتا ہے کہ سونا بھٹی میں جا کر اپنا میل اوپر لے آئے ، حضرت مولانا نے یہ عنوان قرآن مقدس کے اس ارشاد سے استنباط کیا ہے، جیسے سورۂ رعد شریف میں ذکر آتا ہے جو لوگ زیور کو آگ میں تپاتے ہیں اس میں اس طرح کا جھاگ ہوتا ہے اور وہ بھٹی میں تپانے سے الگ نکل آتا ہے۔اس آیہ کی تشریح میں یہ ملتا ہے کہ قرآن مقدس کی اس مثال سے انسانی اخلاق اور ان کے میل سے اخلاقی گراوٹیں مراد ہیں اور آگ میں تپانا سے ریاضات ومجاہدات مراد ہیں۔

بگذ راز ظن خطا اے بد گمان
ان بعض الظن اثم را بخواں

اس شعر میں ایک زبردست بد عملی سے روکا جا رہا ہے، فرماتے ہیں اے قاری طالب بدگمانی کے گناہ سے بچ اور لوگوں پر بدگمانی کرنا چھوڑ دے، دوسرے مصرعہ میں قرآن مقدس کی آیہ کریمہ کوٹ کر دی گئی ہے۔سورۂ حجرات کے اندر یہ ارشاد موجود ہے، ایمان والو! بدگمانی سے بچو کہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔

گر نبودے کارش الہام الٰہ
اُو سگے بودے دراندہ نہ شاہ

پہلے شعر میں زرگر کے قتل پر بادشاہ کے بارہ میں بدگمانی کرنے سے روکا گیا ہے، اس میں فرمایا جارہا ہے اگر زرگر کو قتل کرنا الہام پر مبنی نہ ہوتا تو یقیناً یہ بادشاہ چیر پھاڑ کرنے والا کتا ہوتا، اگر بادشاہ نے اس زرگر کو اپنے نفس کی خاطر قتل کیا ہوتا تو اس کا خیال اس کتے کے فعل سے ہوتا جو کسی بے گناہ کو چیر پھاڑ کر کھا جاتا ہے۔

پاک بود از شہوت و حرص و ہوا

نیک کرد او لیک نیک بد نما

اس شعر میں بھی بادشاہ کی حمایت کی جارہی ہے کہ بادشاہ کے قتل کا عمل کسی حرص یا شہوت پر مبنی نہ تھا مگر یہ اچھا کام بظاہر برا لگتا ہے۔

گر خضر در بحر کشتی را شکست

صد درستی در شکست خضر ہست

فرماتے ہیں حضرت خضر علیہ السلام نے دریا میں کشتی کو توڑا تھا بظاہر تو برا لگتا تھا کہ کشتی والوں نے کرایہ نہ لیا ان سے بھلائی کی پھر کشتی توڑ ڈالی تھی مگر اس توڑنے میں بھی کئی بہت اچھی حکمتیں تھیں جس سے ظاہر ہے کئی کام ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر اچھے نہیں لگتے مگر ان میں حکمت پوشیدہ ہوتی ہے جیسے خضر علیہ السلام نے کشتی توڑ دی۔ حکمت یہ تھی کہ آگے ظالم آدمی تھا جو اچھی کشتیوں پر قبضہ کر لیتا تھا اس کشتی میں نقص ڈالنے سے ملاحوں کی یہ کشتی ظالم سے بچ گئی۔

وہم موسیٰ باہمہ نور و ہنر
شُد ازاں محجوب تو بے پر مپر

اس شعر میں بھی قدرت کے مخفی رازوں کا ذکر کیا جا رہا ہے، موسیٰ علیہ السلام جیسے عظیم نبی بھی بعض اوقات خضر علیہ السلام کے اس کام پر پریشان ہو گئے اور اعتراض کر دیا عام آدمی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ کسی راز کا انکار کرے۔

سیدنا خضر علیہ السلام کے نبی ہونے پر جمہور نے اتفاق کیا ہے، اور ایک نبی کا دوسرے نبی سے کسی کمال کا زیادہ ہونا دوسرے نبی کیلئے توہین نہیں ہوتی۔ قرآن مقدس فرماتا ہے تیسرے پارہ کا آغاز بھی اس طرح ہے، ''رسولوں میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی'' خضر علیہ السلام کشتی توڑنے، بچے کو مارنے، گرنے والی دیوار کو کھڑا کرنے سے علم میں موسیٰ علیہ السلام سے آگے ہوں تو آپ کا جزوی معاملات میں آگے ہونا۔ موسیٰ علیہ السلام کی شان میں نقص پیدا نہیں کرتا جب موسیٰ علیہ السلام کا نورانی خیال بھی اس راز سے دور رہا تو کسی عام آدمی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ راز کی باتوں میں بے سر و پا باتیں کرتا پھرے۔ اس واقعہ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام کے علم باطن سے کم تھے اس لئے کہ شریعت مطہرہ کا علم ظاہر و باطن کا مجموعہ ہے کوئی صاحب شریعت علم باطن میں کسی نبی سے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ خضر علیہ السلام کے یہ تین کام کشتی کا توڑنا، بچے کا قتل کرنا، دیوار کا کھڑا کرنا حکمت پر مبنی تھے، اور پھر صاحب شریعت رسول پر یہ لازم بھی نہیں کہ وہ تمام جزئیات کی حکمتوں پر حاوی ہو۔

آں گل سرخ ست تو خونش مخواں

مست عقلست او تو مجنونش مداں

کسی کی ظاہری شکل وشباہت سے متأثر ہو کر کچھ سمجھ لینا اچھا نہیں اگر کوئی شخص مشاہدہ جمال سے ست ہو گیا تو اُسے کم عقل نہ سمجھو دیوانہ نہ کہو، مولانا اس شعر میں بادشاہ کی برأت ثابت کر رہے ہیں کہ وہ تو پھول ہے تم اُسے خون نہ کہو وہ تو ایک روحانی کرنٹ سے مست ہو گیا اُسے پاگل کہتے ہو۔

گر بُدے خونِ مسلماں کام او

کافرم گر بردمے من نام او

اس شعر میں بھی مولانا بادشاہ کی حمایت دہرا رہے ہیں کہ زرگر کو قتل کرنے میں وہ مجرم قطعی نہیں اگر مسلمان کا خون کرنا اس کا مقصد ہوتا تو میں اس کا نام تک بھی نہ لیتا، تعریف کرنا تو بڑی بات ہے۔

مے بلرزد عرش از مدح شقی

بدگمان گردد ز مدحش متقی

فرماتے ہیں بداصل، بدذات آدمی کی تعریف سے تو خدا کا عرش کانپ جاتا ہے، بدکردار کی تعریف سے پرہیز گار لوگ پریشان ہو جاتے ہیں، پہلے اشعار کی تائید ہے اگر بادشاہ بدکردار ہوتا تو میں تعریف بھی نہ کرتا۔ مولانا کے اس شعر کا عنوان حضور ﷺ کے ایک ارشاد میں اس طرح ملتا ہے، فرمایا جب بدکار کی تعریف کی جاتی ہے تو

”غضب الرب واھتزلہ العرش“ اللہ ناراض ہوتا ہے اس کا عرش کانپ جاتا ہے، دوسرے مصرعہ میں فرمایا جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو پرہیزگار لوگ بھی پریشان ہوتے ہیں اور بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ تعریف کرنے والا بھی اسی گروہ کا ہے۔

شاہ بود و شاہ بس آگاہ بود
خاص بود و خاصۂ اللہ بود

اس شعر میں بھی مولانا بادشاہ کی اچھائی کی تعریف کر رہے ہیں فرماتے ہیں یہ بادشاہ ہی نہ تھا بلکہ عارف بھی تھا وہ ایک خاص آدمی اور خدا کے خاص بندوں میں سے تھا۔

آں کسے را کِش چنیں شاہے کشد
سوئے تخت و بہتریں جاہے کشد

فرماتے ہیں جس شخص کو ایسا پاکباز نیک سیرت بادشاہ قتل کر دے تو یہ قتل رحمت ہے برکت ہے عظمت ہے حقیقت میں وہ قتل نہیں بلکہ مقتول کو بلند و بالا مقام کی طرف لے جاتا ہے، ایسا قتل تو قابل شکر ہے، فرماتے جیسے خضر علیہ السلام کے ہاتھ سے قتل ہونے والا بچہ گناہوں سے بچ گیا، بلند مقام پالیا کہ بعد میں یہ زرگر بھی کوئی بلند مقام حاصل کر لے۔

نیم جاں بِستاند و صد جاں دہد
آنچہ در ہمت نیاید آن دہد

اشعار بالا کے مسئلہ کو ہی اس انداز میں فرماتے ہیں کہ اگر وہ آدھی جاں لے گا بھی تو سو جانیں دے بھی دے گا اور ایسے انعام سے نوازے گا کہ تیرے وہم و خیال سے بالا ہو گا جیسے عارفین میں مشہور ہے، کشتگان تسلیم و رضا کے کو ہر لمحہ غیب سے حیات ملتی رہتی ہے۔ پہلے اشعار میں تھا کہ زرگر کا قتل اس کی کامیابی کیلئے تھا، عزت کیلئے تھا بالفرض یہ قتل زرگر کے عذاب کیلئے ہی تھا تو یہی اس پر غلط قیاس آرائی جائز درست نہیں، زرگر کے زندہ رہنے میں یہ قباحت تھی اگر وہ زندہ رہتا اور بادشاہ کنیزک کے عشق میں ہلاک ہو جاتا تو قوم ایک منصف عادل حکمران سے محروم ہو جاتی اور ملک کے خرابی پیدا ہو جاتی۔

طفل می لرزد زنیش احتجام
مادر مشفق دران غم شاد کام

پہلے مضمون کو دوسرے انداز میں پیش فرما رہے ہیں کہ بچہ پچھنے کے زخم سے ڈر کر کانپتا ہے مگر مہربان ماں اس حالت میں بھی اس کے پچھنے لگوانے میں خوش ہے کہ یہ زخم بچے کیلئے مفید ہے اور اُسے صحت یابی کی طرف لے جانے کا باعث ہے۔ خلاصہ کے طور پر فرمایا کہ زرگر کا درد مصیبت دراصل عافیت تھی اور صحت تھی۔

تو قیاس از خویش مے گیری و لیک
دُور دور افتادۂ بنگر تو نیک

فرماتے ہیں اے طالب قاری تو قدرت کے کاموں کو اپنے پر قیاس کرتا ہے مگر اس پر اچھی طرح غور کرے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تو حقیقت سے دور ہے۔

پیشتر آ تا بگویم قصۂ
بو کہ یابی از بیانم حصۂ

فرماتے ہیں تو کچھ اور آگے بڑھ میں تجھے واقعہ سناؤں شاید اس سے تم میرے بیان کو کچھ سمجھ سکو۔

بود بقالے مر اُو را طوطیے
خوشنوا و سبزو گویا طوطیے

اس شعر میں مولانا نے ایک دکاندار اور اس کے طوطی کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں کسی دکاندار کے پاس ایک طوطی تھا جس کی آواز اچھی تھی باتیں کرتا تھا۔

بر دکاں بودے نگہبانِ دکاں
نکتہ گفتے با ہمہ سوداگراں

زمانے میں وہ طوطی دکان پر بیٹھا رہتا دکان کی حفاظت کرتا، آنے جانے والے لوگوں سے باتیں کرتا لوگوں سے دلچسپ باتیں کرتا رہتا۔

در خطاب آدمی ناطق بُدے
در نوائے طوطیاں حاذِق بُدے

لوگوں سے مخاطب رہتا عقل کی باتیں کرتا اپنے مثل طوطیوں کے بولنے چہچہانے میں بڑا ماہر تھا۔

خواجہ روزے سُوئے خانہ رفتہ بود

در دُکاں طوطی نگہبانی نمود

فرماتے مالک دکان ایک دن گھر گیا ہوا تھا اور یہ طوطی دکان کی حفاظت کر رہا تھا۔

گر بہ بر جست ناگہ از دکان

بہر موشے طوطیک از بیم جاں

جست از صدرِ دکاں بہر گریخت

شیشہائے روغنِ بادام ریخت

مالک دکان سے غیر حاضر تھا طوطی اکیلا نگرانی کر رہا تھا، اتفاق ایسا ہوا کہ اچانک ایک بلی چوہا پکڑنے کی غرض سے اُچھلی اور یہ طوطی اپنی جان کے خوف سے اُڑنے لگا اور اس کی پرواز نے روغن بادام کی بوتلیں گرا دیں۔

از سوئے خانہ بیامد خواجہ اش

بر دکان بنشست فارغ شاد و خوش

مالک دکان جو گھر گیا ہوا تھا گھر سے فارغ ہو کر دکان پر آیا اور خوشی خوشی دکان پر بیٹھ گیا۔

دید پُر روغن دُکان و جاش چرب

بر سرش زدگشت طوطی کل زضرب

دکان پر بیٹھنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ تیل پھیلا ہوا ہے اور جگہ چکنی ہے

تو اس نے طوطی کے سر پر کچھ مارا جس سے وہ گنجا ہو گیا۔

روز کے چندے سخن کوتاہ کرد

مردِ بقال از ندامت آہ کرد

مالک کی اس مار سے طوطی چند دن تک نہ بولا، خاموش رہا، طوطی کی اس دلچسپ گفتگو سے مالک دکان محروم رہا تو اُسے اپنے کیئے پر شرم محسوس ہوئی کہ اُسے طوطی کو مارنا نہیں چاہیئے تھا۔

ریش بر میکند و میگفت اے دریغ

کافتاب نعمتم شد زیرِ میغ

مالک دکان اپنی شرمندگی میں اپنی داڑھی کے بال نوچتا تھا اور کہتا تھا افسوس میری نعمت کا آفتاب بادل کے نیچے آ گیا۔

دست من بشکستہ بودے آنزماں

چوں زدم من بر سرِ آں خوش زباں

مالک دکان نہایت افسوس سے کہتا کاش طوطی کو مارتے وقت میرا ہاتھ ٹوٹ جاتا اور میں یہ حرکت نہ کرتا، طوطی گنجا نہ ہوتا اس کی دلچسپ گفتگو ختم نہ ہوتی۔

ہدیہ ہا میدار ہر درویش را

تا بیابد نطق مرغ خویش را

مالک دکان اس پریشانی میں لوگوں میں صدقہ خیرات کرتا تھا، نذر نیاز دیتا

تھا کہ اس کے پرندے کی دلچسپ باتیں پھر لوٹ آئیں اور یہ مالک دوکان پھر حسب سابق اس سے ذوق حاصل کر لے اور اس کی دکان کی چہل پہل پھر ہو۔

بعد سہِ روز وسہِ شب حیران و زار
بر دکاں بنشستہ بُد نو میدوار

دکاندار طوطی کو مارنے اُسے گنجا کرنے کے تین دن رات کے بعد جب دکان پر بیٹھا تو سخت حیران تھا بدحال تھا پریشانی میں بیٹھا کہ وہ پہلی چہل پہل رونق اور طوطی کا بولنا نہ تھا۔

با ہزاراں غصہ و غم گشت جفت
کاے عجب ایں مرغ کے آید بگفت

یہ دکاندار نہایت پریشان اور غم وغصہ میں تھا، سوچ رہا تھا کہ یہ پرندہ کب بولنے لگے گا

مینمود آں مرغ را ہر گوں شگفت
در تعجب لب بدنداں میگرفت

یہ دکاندار اس پرندے کو ہر شے دکھاتا کہ کسی طرح بولنے لگے جب اس کی ساری کوششیں ناکام ہو جاتیں تو پھر از خود اپنے غصے میں اپنے لبوں کو دانتوں تلے دباتا۔

دمبدم میگفت از ہر در سخن
تا کہ باشد کاندر آید در سخن

پہلے شعر کی ہی تائید ہے کہ یہ دکاندار طرح طرح کی ادھر اُدھر کی باتیں کرتا طوطی کو بلانے کی کوشش کرتا کہ باتیں کرنے لگے مگر نا کام رہنا۔

ناگہانے جویقے میگزشت

با سر بیمو بستان طاس و طشت

دکاندار کی اس پریشانی، طوطی کے نہ بولنے کے غم کے دوران ہی وہاں سے ایک گدڑی پوش گزرا جس کا سر گنجا تھا اور تھال کی طرح صاف تھا۔

طوطی اندر گفت آمد در زماں

بانگ بروے زد بگفتش در عیاں

اس گدڑی پوش گنجے فقیر کا گزرنا تھا کہ طوطی نے اُسے دیکھا اور بول پڑا۔

کزچہ اے کل باگلاں آمیختی

تو مگر از شیشہ روغن ریختی

طوطی نے اس گنجے گدڑی پوش سے کہا اے گنجے تو کس طرح گنجوں میں شامل ہوگیا، شاید میری طرح تو نے بھی بوتل سے تیل گرایا ہوگا۔

از قیاسش خندہ آمد خلق را

کوچُو خود پند اشت صاحب دلق را

طوطی کے اچانک بولنے اور اس انداز میں بات کرنے گدڑی پوش کے گنجا ہونے کو اپنے پر قیاس کرلیا کہ اس نے بھی بوتل سے تیل گرایا ہوگا طوطی کے اس قول

سے لوگ مسکرائے۔

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن سیر شیر

دکاندار اور طوطی کے قصہ سے مولانا درس دے رہے ہیں اے پیارے نیک وپاک لوگوں کے معاملہ کو اپنے پر قیاس نہ کرنے کے معنی میں ہے اگر چہ لکھنے میں شیر اور شیر ایک جیسے ہیں مگر دونوں کے کوائف الگ الگ ہیں، (شِیر دودھ) جسے لوگ پیتے ہیں اور شیر وہ جانور ہے جو لوگوں کو چیرتا پھاڑتا ہے۔

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد
کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد

فرماتے ہیں اس غلط قیاس کے سبب بہت سے لوگ بھٹک گئے شاید ہی کوئی شخص ابدال سے واقف ہو، ابدال اولیاء کرام میں ایک طبقہ ہے جو کسی شکل وصورت میں تبدیلی لا سکتے ہیں، عام لوگوں کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا ابدالوں کے بارہ میں ذکر ہے کہ ان کی تعداد سات ہے۔ مجھے ایک موقع پر ابدال کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، میں مدینہ منورہ میں روضہ اطہر پر حاضر تھا، دعا میں مصروف تھا ان دنوں مسجد اقصیٰ پر یہود کی یلغار ہوئی تھی، اس صدمہ سے رقت طاری تھی جب دعا سے فارغ ہوا تو میرے پیچھے چند شامی علماء کھڑے تھے، شائد وہ میری دعا سے متاثر ہوئے، یا ویسے ہی انہوں نے مجھے کہا کیا تو چاہتا ہے تجھے ابدال کی زیارت کرائیں میں بے حد خوش ہوا کہ یہ زیارت بہت بڑی سعادت ہے مجھے لے کر چلے میں نے راستہ میں اپنے جی میں

خیال کیا کہ ان سے دعا کراؤں گا کہ مجھے اگلے سال بھی مدینہ منورہ کی حاضری نصیب ہو، حسن اتفاق سے یہ بزرگ باب عمر سے اندر داخل ہوئے اور آتے ہی ذکر الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ میں بھی ان کے سامنے بیٹھ گیا، چند منٹوں کے بعد انہوں نے مجھے اشارہ سے بلایا اور کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا ''انك تــاتــی فی السنة الآتــی ''تو آئندہ سال بھی آئے گا، مجھے ان کے ابدال ہونے کا فوری یقین ہو گیا کہ میرے دل کی بات پر مطلع ہو کر مجھے خوشخبری سنائی چنانچہ اگلے سال انتہائی حالات خراب ہونے کے باوجود حاضری نصیب ہوئی وللہ الحمد پھر کئی سال اسی جگہ جاتا رہا مگر زیارت سے محروم رہا۔

اشقیا را دیدۂ بینا نبود
نیک و بد در دیدہ شاں یکساں نمود

اس شعر میں مولانا بعض بدنصیب اور بدبخت لوگوں کا ذکر کرتے ہیں کہ بد نصیب لوگ حق دیکھنے والی آنکھ سے محروم تھے اس لئے ان کی نظر میں اچھا برا ایک جیسا دکھائی دیا۔

ہمسری با انبیاء برداشتند
اولیاء را ہمچو خود پنداشتند

ان بدبخت کم ظرف لوگوں نے انبیاء علیہم السلام سے ہمسری کا دعویٰ کر دیا اور انبیاء علیہم السلام کو بھی اپنے جیسا ہی خیال کرنے لگے اور اولیاء کے ساتھ مقابلہ کی صورت پیدا کر لی یہ ان کی سراسر جہالت ہے کم علمی ہے کم عقلی ہے ایسے لوگ تو اولیاء

کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برابری کا دعویٰ پر لے درجہ کی بدبختی ہے کہ انبیاء بھی انسان ہم بھی انسان، وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی۔ ان کی اس جہالت کا ذکر قرآن مقدس نے اس طرح فرمایا "قالو ان انتم الا بشر مثلنا" بدبخت لوگوں نے انبیاء سے کہا تم بھی بشر ہو ہم بھی بشر ہیں کفار نے یہ بھی کہا یہ کیسا رسول ہے بازار میں چلتا پھرتا ہے کھاتا پیتا ہے۔

ایں ندانستند ایشاں از عمیٰ
ہست فرقے درمیاں بے منتہیٰ

ان بدبخت لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ ان دونوں فریقوں میں بے انتہا فرق ہے ان نگاہوں میں حقیقت کو دیکھنے والا نور نہیں یہ اس نعمت سے محروم ہیں کہ لعل اور پتھر کا فرق نہیں کر سکے اس فرق کو تو کوئی جوہری ہی سمجھ سکتا ہے۔

ہر دو گوں زنبور خوردند از محل
لیک شد زاں نیش وزاں دیگر عسل

اسی عنوان کو مولانا نے دوسرے رنگ میں سمجھایا ہے کہ شہد کی مکھی اور بھڑ نے ایک ہی پھول اور شگوفہ سے چوسا ہے مگر دونوں کے اثر میں فرق بے تحاشا ہے شہد کی مکھی کا ڈنگ کچھ اور کیفیت کا ہے اور بھڑ کا ڈنگ اور کیفیت کا ہے۔ اگلے شعر میں اسی عنوان کو دوسری مثال میں فرماتے ہیں کہ دونوں قسم کے ہرنوں نے ایک ہی جگہ سے گھاس کھائی ایک ہی گھاٹی سے پانی پیا مگر اثر دونوں میں الگ الگ ہے، ایک ہرن سے مینگنیاں بن گئیں اور دوسرے سے خالص کستوری۔

ہر دو نَے خوردند از یک آبخور

آں یکے خالی و آں پر از شکر

پہلے شعر کے عنوان کو ہی اس میں دہرایا جا رہا ہے کہ دونوں قسم کے نَے ایک ہی گھاٹ سے سیراب ہوئے مگر ایک خالی ہے دوسرا شکر سے بھرا معلوم ہوتا ہے۔

صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ بیں

فرق شاں ہفتاد سالہ راہ بیں

فرماتے ہیں ایسی ہی ہزاروں مثالیں ملیں گی ان مثالوں میں ستر سال کی راہ کا فرق پاؤ گے۔

ایں خورد گردد پلیدی زو جُدا

واں خورد گردد ہمہ نُور خدا

یہ کھاتا ہے تو اس سے نجاست بنتی ہے اور وہ کھاتا ہے تو اس سے سب نور ہی بنتا ہے۔

ایں خورد زاید ہمہ بخل و حسد

واں خورد زاید ہمہ نورِ احمد

انبیاء سے ہمسری کرنے والوں کو ہدایت دے رہے ہیں کہ سوچو تمہاری خوراک پلید بنتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی خوراک نور بنتی ہے۔

ایں خورد زاید ہمہ بخل و حسد

داں خورد زاید ہمہ نور احد

(اہل اللہ سے ہمسری کرنے والا) کھاتا ہے تو اس کی خوراک سے سارے کا سارا بخل حسد پیدا ہوتا ہے اور ان (اللہ والوں کی) خوراک سے نور بنتا ہے، مفہوم یہ ہے کہ تمام نیک و بد آدمی غذا تو ایک ہی قسم کی کھاتے ہیں مگر نیک آدمی کی غذا اس کے جسم کو بحال رکھ کر نیک اعمال پر آمادہ رکھتی ہے اور برے آدمی کی خوراک اس کو برائی پر اکساتی ہے۔

این زمینِ پاک و آں شورست و بد
این فرشتہ پاک و آں دیوست ود

اللہ والوں کی زمین پاک ہے اور غیروں کی زمین شوداور خراب ہے، اللہ والا تو پاک فرشتہ ہے اور وہ شیطان اور درندہ ہے۔

ہر دو صورت گر بہم ماند رواست
آب تلخ و آب شیریں را صفا ست

پہلے ہی عنوان کو دوسرے انداز میں فرما رہے ہیں کہ نیک اور بد کی صورتیں تو ایک جیسی ہی دکھائی دیتی ہیں مگر حقیقتاً فرق ہے جیسے میٹھا اور کڑوا پانی دیکھنے میں ایک ہی صفائی ایک ہی طرح کا ہے مگر فرق بے تحاشا ہے یہی حال صوفی کا ہے اور غیر صوفی کا۔

جز کہ صاحب ذوق کہ شناشد بیاب
او شناسد آب خوش از شورہ آب

فرماتے ہیں اہل ذوق کے بغیر کوئی دوسرا کون جان سکتا ہے فرماتے ہیں کسی

اللہ والے سے ہی حقیقت کا پتہ چل سکتا ہے وہی میٹھے کڑوے پانی کا امتیاز کر سکتا ہے، علم وعمل والا ہی کھوٹے کھرے کی پہچان کر سکتا ہے، اہل اللہ سے اپنے کو وابستہ کر کے حقیقت تک پہنچ سکے، اللہ والوں کا قرب حاصل کر جیسے بھی ہو سکے کہ وہی تیرے عشق و محبت کی کشتی کو کنارے لگانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

جز کہ صاحب ذوق کہ شناسد طعوم
شہد رانا خوردہ کے داند زموم

فرماتے ہیں عشق و محبت والے کے بغیر ذائقوں کو کون پہچان سکتا ہے جس شخص نے کبھی شہد کھایا ہی نہ ہو وہ شہد میں اور موم میں کیا فرق کر سکتا ہے۔

سحر را با معجزہ کردہ قیاس
ہر دو رابر مکر بنہادہ اساس

اسی عنوان کو ایک اور مثال سے واضح فرما رہے ہیں، فرماتے ہیں معجزہ اور جادو بظاہر دونوں حیران کن ہیں مگر یہ حقیقت واضح ہے کہ معجزہ نبی کا عمل ہے نبی کو خدا کی طرف سے عطا ہے اور جادو شیطانی عمل ہے، معجزہ میں یہ کمال ہے یہ تمام عوالم علوی سفلی میں یکساں ہوتا ہے جادو کی یہ حالت نہیں یہ صرف عالم سفلی میں محدود ہے اور محض نظر کا فریب ہے اور جادو کی کیفیت عارضی ہے جبکہ معجزہ مستقل ہے دائمی ہے حق سے دور لوگ جادو اور معجزہ کو ایک ہی قیاس کرتے ہیں کفار نے انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو جادو ہی کہا، فرماتے ہیں اہل اللہ اور غیر میں فرق سمجھو جب تک یہ فرق سمجھ نہیں آئے گا عشق و محبت کی راہ سے آگاہ نہ ہو سکو گے۔

ساحراں با مُوسیٰ از استیزہ را
برگرفتہ چوں عصائے او عصا

موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں فرعون کے جادوگروں نے بھی آپ کے عصا کی طرح عصا اُٹھایا، موسیٰ علیہ السلام کے عصا میں یہ کمال معجزہ ظاہر ہوا تھا کہ وہ بہت بڑا اژدہا بن کر دوڑا، فرعون کے جادوگروں نے بھی رسیاں لاٹھیاں ڈال کر اُن پر جادو کیا اور وہ رسیاں لاٹھیاں دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

زیں عصا تا آں عصا فرقیست ژرف
زیں عمل تاآں عمل را ہے شگرف

فرماتے ہیں بظاہر تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ رسیاں دوڑ رہی ہیں لاٹھیاں بھاگ رہی ہیں مگر حقیقت میں ان دوڑوں میں بہت بڑا فرق تھا بہت لمبا فاصلہ تھا۔

لعنۃ اللہ ایں عمل را در قفا
رحمۃ اللہ آں عمل را در وفا

ان دونوں کے فرق کو اس طرح فرماتے ہیں جادوگروں کے پیچھے خدا کی لعنت ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے معجزہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بہت بڑا حصہ ہے جادوگروں کو کامیابی نہیں وہ ہر لحاظ سے ناکام اور ذلیل ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ خدا کی رحمت مددگار سے وہ کامیاب ہیں کہ حکم ہوتا ہے موسیٰ اپنے عصا کو زمین پر ڈالو وہ ان تمام لاٹھیوں رسیوں کو ہڑپ کر جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

کافراں اندر مرے بوزینہ طبع
آفتے آمد درُون سینہ طبع

اس شعر میں مولانا نے انبیاء علیہم السلام کی ہمسری کا دعویٰ کرنے والوں، اپنے جیسا کہنے والوں کی مذمت فرمائی ہے فرماتے ہیں کفار حضور ﷺ سے جو ہمسری کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کے سینوں میں بندر کی خصلت کام کر رہی ہے، ان کی یہ عادت سینوں میں چھپی ہوئی ہے وہ ہمسری کا دعویٰ اس لئے کرتے ہیں کہ مال و دولت حاصل کریں اس لئے یہ بدنیتی ان کیلئے مصیبت ہے۔

ہرچہ مردم میکند بوزینہ ہم
آں کندکز مرد بیند دمبدم

فرماتے ہیں بندر بھی بندے کی طرح ہی نقل کرتا ہے جو کچھ وہ بندے کو کرتے دیکھتا ہے وہی کرنے لگتا ہے کام تو بظاہر وہ بندے والا ہی معلوم ہوتا ہے مگر اس کام کے کرنے والا تو بندہ نہیں وہ تو بندر ہی ہے بندر ہی رہے گا، انسان اور بندر کا فرق واضح ہے، جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام کی طرح رسیاں دوڑائیں مگر یہ جادو ہے موسیٰ علیہ السلام کا کام معجزہ ہے موسیٰ اللہ کے رسول ہیں، یہ فرعونی اللہ کے گستاخ نافرمان ہیں۔

او گماں بُردہ کہ من کردم چُو او
فرق را کے بیند آں استیزہ جو

بندر خیال کرتا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا بندے کی طرح کیا مگر یہ بندر فسادی جانور اصل و نقل کو کس طرح سمجھ سکتا ہے۔

ایں کند از امرو آں بہرِ ستیز
بر سرِ استیزہ رویاں خاک بیز

اس شعر میں نبی اور غیر نبی کے مسئلہ کو بیان کرتے ہیں کہ نبی جو کچھ کرتا ہے، رب قدوس کے حکم سے کرتا ہے اس کا کام خدا کا کام ہے اس کا بولنا خدا کا بولنا ہے اسکا حکم خدا کا حکم ہے مگر کافر کا ہر کام محض فساد ہے جھگڑا ہے، فتنہ ہے ایسے جھگڑالو لوگوں کے سروں پر خاک ڈالو اُن کے مکر وفریب اور دھوکہ سے بچ جاؤ کہ اُخروی نجات حاصل کرسکو۔

آں منافق با موافق در نماز
از پئے استیزہ آید نے نیاز

فرماتے ہیں منافق اسلام دشمن بندہ مسلمان کے ساتھ مل کر نماز پڑھتا ہے تو وہ محض مقابلہ کیلئے پڑھتا ہے، اطاعت خداوندی یا اسلام کی وفاداری کا مقصد نہیں ہوتا۔

در نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ
با منافق مومناں در برد و مات

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ میں ایماندار لوگ منافقوں کے ساتھ ہار جیت کے میدان میں جنگ آزما ہیں۔

مومناں را بُرد باشد عاقبت
با منافق مات اندر آخرت

فرماتے ہیں آخر کار مومنوں کو فتح ہوگی اور قیامت کو منافق کو شکست ملے گی۔
آج دنیا میں جو مومن اور منافق ہے ایک ہی رنگ میں دکھائی دیتے ہیں قیامت کو ان کے درجے الگ الگ ہوں گے جیسے قرآن مقدس فرماتا ہے ''وامتازو الیوم ایھا المجرمون ''مجرموں الگ ہو جاؤ، مومن اپنے ایمان کے باعث کامیاب ہوں گے منافق رسوا ہوں گے۔

ہر یکے سوئے مقام خود رود
ہر یکے بروفق نام خود رود

قیامت کے دن ہر ایک اپنے اپنے مقام کی طرف جائے گا اور ہر ایک اپنے نام کے موافق چلے گا۔ مومن جنت میں ہوگا اور منافق دوزخ میں جیسا کسی کا نام ہوگا ویسا ہی اس کا انجام ہوگا۔

مومنش خوانیش جانش خوش شود
در منافق تند و پُر آتش شود

اگر اُسے مومن کہتے ہیں تو بے حد خوش ہوتا، منافق کہا جائے تو پریشان ہو جاتا ہے غصے سے بھر جاتا ہے۔ بظاہر نماز، روزہ میں دونوں کا کام ایک سا ہی معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں مومن اور منافق کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

نام آں محبوب از ذات و یست
نام ایں مبغوض از آفات ویست

مومن کا نام اس کی ذات کی وجہ سے محبت والا اور پیارا لگتا ہے ایسے ہی منافق کا نام اس کی ناپسندیدہ حرکتوں کے باعث برا لگتا ہے۔

گر منافق خوانیش ایں نام دوں
ہمچو کژدوم مے خلد در اندروں

اگر منافق کو منافق کہہ دو تو یہ منحوس نام اُسے بچھو کی طرح کاٹتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ نام میں کوئی اور شے اثر انداز ہے، مولانا کے اس شعر سے ایک اور اہم بات بھی واضح ہوتی ہے کہ بچوں کے نام بھی اچھے رکھے جائیں بے معنی نام رکھنے سے پرہیز کیا جائے، بچوں بچیوں کے نام رکھتے وقت سوچا جائے کہ یہ نام اسلام شریعت کے مطابق ہیں، اسلامی ناموں کے علاوہ نام رکھنے سے بچا جائے کہ برے ناموں کی نحوست اثر انداز ہوتی ہے، اچھے ناموں کی برکت عزت بخشتی ہے۔ حضور ﷺ برے ناموں کو بدل دیتے تھے، ایک خاتون کا نام ''برّہ'' تھا جس میں پارسائی کا دعویٰ ملتا تھا آپ نے اس کا نام ''زینب'' رکھ دیا، ایک شخص کا نام ''حزن'' تھا بمعنی غم آپ نے اس کا نام ''سہیل'' رکھ دیا۔

زشتی ایں نام بد از حرف نیست
تلخی آں آب بحر از ظرف نیست

نام کی خرابی حرف کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے معنی سے ہے پانی کا میٹھا کڑوا ہونا برتن کی وجہ سے نہیں بلکہ خود پانی کے وجود میں یہ مٹھاس اور کڑواہٹ ہے۔

حرف ظرف آمد در و معنی چو آب
بحر معنی عندہ اُم الکتاب

اس شعر میں بھی پہلے عنوان کو دوسرے انداز میں پھر دہرایا گیا ہے کہ حرف کی حیثیت تو برتن کی ہے اور اس حرف میں معنی پانی کی طرح ہے، اور دریائے معنی تو وہ خود ذات گرامی ہے جس کے پاس اُم الکتاب لوح محفوظ ہے وہ ذات پاک سب سے اول آخر ہونے کے لحاظ سے سمندر سے مشابہ ہے، سورۂ رعد میں ہے ''اس کے پاس لوح محفوظ ہے جسے چاہتا ہے منسوخ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے''

بحر تلخ و بحرِ شیریں ہمعناں
درمیاں شاں برزخ لا یبغیان

مومن و منافق، ایمان و نفاق کا ذکر کرتے مزید فرماتے ہیں بُری عادات کا کڑوا دریا اور حسین عادات کا میٹھا دریا ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ان کے درمیان ایک آڑ ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر غالب نہیں ہوتے یہ دونوں دریا چل رہے ہیں عام آدمی کو فرق محسوس نہیں ہو سکتا کہ اخلاص کے ساتھ عبادت کس کی ہے اور دکھاوے کیلئے کون عبادت کر رہا ہے۔ دونوں طرح کے بندوں سے ایک جیسے اعمال کا ظہور حقیقت پہچاننے میں رکاوٹ بنتا ہے ان میں ایک خاص حد فاصل ہے جو ایک دوسرے سے جدا کر رہی ہے اور یہ حد فاصل برزخ ہے۔

داں کہ ایں ہر دوز یک اصلی رواں
درگز زیں ہر دو تا معنی آں

ان دونوں دریاؤں کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ کڑوا دریا اللہ تعالیٰ کے اسم مضل سے ظاہر ہوتا ہے، اور میٹھا دریا اللہ تعالیٰ کے اسم الہادی سے نکلتا ہے، ان دونوں متضاد صنعتوں کی اصل ذات حق ہے، سالک کو چاہیئے کہ اس تفرقہ سے گذر کر خاص ذات واحد جل مجدہ سے واصل ہو۔

زرّ قلب و زرّ نیکو در عیار
بے محک ہر گز ندانی اعتبار

دونوں دریاؤں میں فرق کرنے کیلئے ضروری ہے کہ کسوٹی ہو جو کھرے اور کھوٹے کا امتیاز کر سکے، بھلے اور برے آدمی کو پہچانا جا سکے جیسے کھرے کھوٹے سونے کے پہچاننے کیلئے کسوٹی ضروری ہے، اس کے بغیر پہچان نہیں ہو سکتی ایسے ہی برے بھلے آدمی کی پہچان کیلئے کوئی کسوٹی ضروری ہے اور وہ کسوٹی شریعت مطہرہ کی اتباع ہے۔

ہر کرا درجاں خدا بنہد محک
ہر یقین را باز داند اوز شک

فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ جس کے دل میں نور بصیرت کی کسوٹی رکھ دیتا ہے وہ جس بندے کو اس دولت سے نواز دیتا ہے وہ ہر ایک یقینی اور غیر یقینی بات میں فرق کر لیتا ہے اور حق پہچاننے کی منزل کو پا لیتا ہے۔

آنچہ گفت استفت قلبک مصطفیٰ
آں کسے داند کہ پُر بود از وفا

اس سے پہلے شعر میں ذکر تھا کہ نیکی بدی میں تمیز کرنے کیلئے روحانی کسوٹی کا ہونا ضروری ہے اور وہ شریعت مطہرہ پر عمل ہے اس ضمن میں آپ اس شعر میں اس کسوٹی کا ذکر فرما رہے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا نیکی بدی کے سلسلہ میں اپنے دل سے فیصلہ لے اس ضابطہ کو عمل میں لانا وہی جانتا ہے جو شریعت مطہرہ کا پابند ہو، احکام الٰہیہ بجالاتا ہو، پہلے مصرعہ میں جو ''استفت قلبك'' کا ارشاد ہے اس کی تفصیل یہ ہے حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا وابصہ تم نیکی اور گناہ کے متعلق پوچھنے آئے ہو میں نے عرض کی جی ہاں تو آپ نے فرمایا ''استفت قلبک'' یہ کلمات آپ نے تین مرتبہ فرمائے، پھر فرمایا نیکی وہ ہے جس سے تیرا دل نفس مطمئن ہوں اور برائی وہ ہے جو تیرے نفس میں کھٹکا اور تردد پیدا کر دے۔ دل سے پوچھنے کا ارشاد خاص اُن لوگوں کیلئے ہے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں جاہل منکر سرکش کیلئے دل سے پوچھنے کا مسئلہ نہیں، یہ ارشاد اہل علم اور اہل تقویٰ کیلئے ہے۔ یہ ضابطہ اس کے لئے ہے جو وفا سے پُر ہو، احکام الٰہی کا پابند ہو اُسے نور بصیرت عطا ہوا ہو اس شخص کا قلب قلب سلیم ہو جاتا ہے اس کا فتویٰ ایسے اُمور میں قابل اعتبار ہوتا ہے۔

در دہان زندہ خاشاک ارجہد
آنگہ آر امد کہ بیرونش نہد

فرماتے ہیں جو شخص اپنے دل سے کھٹکے والی بات کو نظر انداز کر دیتا ہے اس کی پرواہ نہیں کرتا وہ ایسے ہی ہے جیسے زندہ آدمی کے حلق میں نقصان دہ شئ ہے۔

در دہان زندہ خاشاک ارجہد

آنگہ آر امد کہ بیرونش نہد

فرماتے ہیں جو شخص اپنے دل سے کھٹکے والی بات کو نظر انداز کر دیتا ہے اس کی پرواہ نہیں کرتا وہ ایسے ہی ہے جیسے زندہ آدمی کے حلق میں کوئی شئ اٹک جائے تو وہ فوراً محسوس کرتا ہے اس کے برعکس کسی مردہ کو منہ میں داخل ہونے والی شئ کا احساس نہیں ہوتا، ایسے ہی جس شخص میں روحانی کیفیت نہیں ہے وہ دل میں اٹکی برائی کو محسوس نہیں کرتا دوسرا شخص جو روحانیت سے آگاہ ہے وہ فوراً محسوس کر لیتا ہے۔

در ہزاراں لقمہ یک خاشاک خورد

چوں در آمد حس زندے بے ببرد

پہلے شعر کے عنوان کو اس میں فرمایا جا رہا ہے ہزاروں لقموں میں جب چھوٹا سا تنکا آ گیا تو کھانے والے کی حس نے اُسے فوراً محسوس کر لیا یہی حالت صاحب حال درویش کی ہے جب کبھی کوئی غلطی صادر ہوئی، کسی گناہ کا ارتکاب ہو گیا تو وہ جھٹ محسوس کر لیتا ہے اور توبہ و استغفار سے اُسے نکال پھینکتا ہے جو لوگ اپنی اس حسین حیات کے ساتھ زندہ رہتے ہیں وہ اپنے مشتبہ کاموں میں فوراً احساس کر لیتے ہیں۔

حس دنیا نر دبان ایں جہاں

حس عقبٰی نردبان آسمان

فرماتے ہیں دنیا کی حسّ دنیا کے کاموں میں راہنمائی کرتی ہے اور سیڑھی کا کام دیتی ہے جبکہ آخرت کی حسّ آسمانی سفر میں مدد کرتی ہے یہ حسّ بصیرت کو بڑھاتی ہے اور نور معرفت پیدا کرنے میں معاون ومددگار ہوتی ہے یہ حسّ انبیاء واولیاء کا حصہ ہے۔

صحتِ ایں حسّ بجوید از طبیب
صحت آں حسّ بجوید از حبیب

فرماتے ہیں اس دنیا کی حس اور اپنے جسم کی صحت کے متعلق تو کسی طبیب سے پوچھو وہ بتائے گا کہ وہ جسم کا معالج ہے، نبض شناسی کا ماہر ہے، مگر روحانی حس کے متعلق پوچھنا ہے تو وہ دنیا کا طبیب نہیں بتائے گا اس روحانی حس کے متعلق تو حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی بتا سکیں گے کہ وہ روح کے بہترین معالج ہیں اور اس کے کامیاب نسخے انہیں کے پاس ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں نورِ معرفت حاصل کرنے کیلئے حبیب خدا سے وابستگی بہت ضروری ہے اور اس مقام تک پہنچنے کیلئے شیخ کامل کی صحبت لازمی ہے کہ اس کی مدد کے بغیر منزل مقصود پر پہنچنا مشکل ہے، اگلے شعر میں مزید فرماتے ہیں۔

صحت ایں حس زمعموری تن
صحت آن حس زتخریب بدن

دنیا کی حسّ کی صحت جسم کے توانا وتندرست ہونے سے ہے مگر حسّ روحانیت جسم کو محنت عبادت ریاضت میں کمزور کرنے میں ہے، نور معرفت حاصل کرنے کیلئے ریاضت بھی ضروری ہے، ریاضت بھی وہ جو مرشد کامل کی راہنمائی سے ہو اور شریعت کے اصولوں پر چل کر ہو ان پڑھ اور جاہل لوگوں کے ڈھکوسلوں کی

ریاضت سراسر تباہی اور ہلاکت ہے جس سے لازمی ہے کہ بچا جائے، صحیح ریاضت کے بغیر عرفان کا نشہ قطعی نہیں مل سکتا۔ ریاضت کے ایک پہلو کو شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اس طرح بیان کیا ہے

؎ اندروں از طعام خالی دار تا درو نور معرفت بینی

بھوک کی عادت ڈال کہ تیرا اندر نور معرفت سے مالا مال ہو، غالباً شیخ سعدی حصول روحانیت کیلئے نفلی روزے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں میرے نزدیک بھی یہ ریاضت حسین ریاضت ہے۔

شاہِ جاں مر جسم را ویراں کند
بعدِ ویرانیش آباد آں کند

اس شعر میں ریاضت کی اہمیت کو بیان کر رہے ہیں کہ جان بادشاہ (رب قدوس جل مجدہٗ الکریم) جسم کو ریاضت کے ذریعہ سے خستہ حال کرتا ہے پھر جسم کی خستہ حالی پر رحم وکرم اس طرح فرماتا ہے کہ ویرانی کے بعد اُسے معرفت کے نور سے معمور کر دیتا ہے اور جسم کو یہ نور معرفت اس ریاضت کے ذریعہ حاصل ہوا جو اُس نے اپنے شیخ کامل کی ہدایت کے مطابق شریعت مطہرہ کی پاسداری کرتے ہوئے کی، اس شخص کی جسمانی کمزوری اس کی روحانی طاقت کا سبب بن جاتی ہے ایسے لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جو دریائے عشق ومحبت میں غوطہ زنی کیلئے اپنا مال و جان خرچ کر دیتے ہیں۔ اگلے شعر میں اسی عنوان کو واضح کیا ہے کہ وہ جان کس قدر مزے میں ہے جس نے اپنے ذوق کو کمال تک پہنچانے کیلئے دنیا، مال، ملک سب کچھ لٹا دیا۔ ان

دونوں شعروں میں مولانا نے ریاضت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ وہ لوگ بابرکت ہیں جو اپنے ظاہری سامان کو خرچ کر کے آخرت کے وطن کو آباد کرتے ہیں کیا اچھا کہا ہے کسی نے

دل فقر کی موت سے مرا اتنا غنی ہے
دنیا کے زر و مال پہ تف نہیں کرتا

کرد ویراں خانہ بہر گنج زر
وز ہماں گنجش کند معمور تر

اس عشق و محبت کے متوالے نے جو اپنا جسم ریاضت سے برباد کیا ہے اس کی مثال فرماتے ہیں وہ ایسے ہی ہے کہ کسی نے خزانہ نکالنے کیلئے پہلے تو گھر برباد کیا پھر اس خزانہ کے ساتھ اپنے گھر کو پہلے سے زیادہ حسین تعمیر کر لیا، مولانا ”طالب“ کو حوصلہ دے رہے ہیں کہ جسم کی کمزوری بیماری سے ڈرنا نہیں چاہئے اس کا نتیجہ اچھا ہوتا ہے کہ ریاضات و مجاہدات سے روحانی قوت نصیب ہو جاتی ہے اور یہ قوت اس کے بدن کو بھی چار چاند لگا دے گی کہ حقیقی آبادی یہی ہے، فرماتے ہیں وہ شخص قابل رشک ہے جس نے عشق و محبت کے حصول کیلئے اپنی جان کی بازی لگا دی اور دریائے رحمت میں غوطہ زن ہو گیا۔

آب را ببرید جُو را پاک کرد
بعد ازاں در جُو رواں کرد آب خورد

اس شعر میں اوپر کے عنوان کو مثال دے کر سمجھا رہے ہیں کہ اس ”طالب حق“

نے گویا پانی کو بند کر کے نہر کو اچھی طرح صاف کیا ہے اور صفائی کے بعد پھر پانی چلا دیا ہے یعنی اس مرد مومن نے اپنے شیخ کامل کی ہدایات کے مطابق اپنے وجود کو بری عادات سے پاک کیا، گناہوں کی میل کچیل سے صاف کیا پھر اُسی میں نور معرفت کا پانی بھر لیا۔

پوست را بشگافت پیکانزا کشید
پوست تازہ بعد ازانش بردمید

اس سے پہلے شعر کے عنوان کو ہی دوسری مثال سے بیان کر رہے ہیں جسم کو ریاضت سے کمزور کر کے پھر اسی جسم کا نور معرفت سے پر ہونا ایسے ہی ہے جیسے کہ چمڑے کو چیر کر تیر کو کھینچا اس کے بعد اس سے نئی کھال پیدا ہو گئی۔

قلعہ ویراں کرد و از کافر ستد
بعد ازاں برساختش صد برج و سد

یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی نے قلعہ کو برباد کر کے کافر سے چھینا ہے پھر سینکڑوں بُرج اور فصیل تعمیر کر لئے۔ فرما یہ رہے ہیں کہ ریاضت و عبادت کی توپ سے اپنے وجود کے قلعہ کو نفس سرکش سے چھینا اور پھر از سر نو تعمیر کر لینا۔ یہاں پر یہ بھی یاد رہے نفس کے حق کو تو پورا کیا جانا چاہئے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں ''ان لنفسک علیک حقاً '' کہ تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے جسے پورا کیا جائے یہاں پر جسم کو ریاضت ومجاہدہ سے کمزور کرنا اس کے حق پر حملہ نہیں بلکہ اس کی لذتوں کو کمزور کرنا ہے۔

کارِ بیچوں را کہ کیفیت نہد
ایں کہ گفتم ہم ضرورت میدہد

اوپر کے اشعار میں فرمایا تھا کہ نور معرفت حاصل کرنے کیلئے ریاضت و مجاہدہ ضروری ہے اس شعر میں فرما رہے ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کیلئے ریاضت ہی نہیں اور بھی بہت سے وسائل ہیں خدا کے فضل و کرم کا کیا کہنا وہ چاہے تو ریاضت کے بغیر ہی نور معرفت سے نواز دے۔ یہاں جو ریاضت کا ذکر ہوا ہے وہ محض ضرورت کے پیش نظر کیا گیا ہے اور وہ ضرورت یہ تھی کہ خدا تک پہنچنے کا مشہور طریقہ بیان کر دیا جائے۔

گہ چنیں بنماید و گہ ضدّ ایں
جُز کہ حیرانی نباشد کارِ دیں

اوپر کے شعر میں فرمایا تھا کہ رب قدوس جو بے مثل و بے مثال ذات ہے کبھی کسی طرح جلوہ گری فرماتا ہے اور کبھی اس کے برعکس ۔ یہی وہ ایک ذات بابرکات ہے مگر اس کے جلوے مختلف ہیں، اسی وجہ سے طالب کو جو نور معرفت کا متمنی ہے حیرت ہوتی ہے رب قدوس کی تجلیات و واردات حیرت کا سبب بن جاتی ہیں اور دین کے کاموں میں حیرت ہو جاتی ہے، دین کے کاموں میں حیرت سے مراد سلوک کی راہیں ہیں اور یہ حیرت باعث برکت ہے یہاں پر حیرت کے معنی شک و شبہ ہرگز نہیں شک والی حیرت تو بُری ہے۔ یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ کبھی خدا تک پہنچنا ریاضت سے ہوتا ہے جسے دوسرے لفظوں میں سلوک کہا جاتا ہے اور کبھی اللہ کے فضل و کرم سے بغیر ریاضت کے بھی نصیب کھل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ طریقہ ریاضت کا پابند نہیں وہ قادر

ہے کریم ہے جسے چاہے عطا کر دے کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے اللہ تک پہنچنا پہلے ہو جاتا ہے اور ریاضت و مجاہدہ کا شوق بعد میں ہوتا ہے جب عارف ایسے معاملات کو دیکھتا ہے تو قدرتی طور پر اس کو حیرت دامن گیر ہوتی ہے۔ کار دین سے مراد مولانا نے اللہ تک پہنچنا ہی لیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس سے بڑھ کر بڑا کام کوئی ہے ہی نہیں۔

کاملاں کز سرِّ تحقیق آگہند

بے خود و حیران و مست و الہ اند

عارفت کو جو تجلیات واردات سے حیرت ہوتی ہے اسی عنوان کو اس شعر میں فرماتے ہیں، اہل علم و فضل با کمال لوگ جو حقیقت کے راز سے باخبر ہوتے ہیں اس مقام پر وہ بھی حیرانی و مستی کے عالم میں سرگرداں ہیں، پہلے شعر میں ذکر تھا کہ "سلوک" حیرت کا سبب ہے اس شعر میں فرمایا جا رہا ہے کہ سلوک کی راہ میں حیرت کا ہونا اس قدر اہم ہے کہ عام سالک تو حیرت زدہ ہوگا ہی، اس مقام پر تو خدا رسیدہ کامل اولیاء بھی منزل کو مشاہدہ کرتے ہوئے معاملہ قدرت کو دیکھ کر حیران و مست ہیں کہ یہ طالب آگاہ تو ہے مگر حقیقت کا پورا احاطہ اس کے بس سے باہر ہے خواہ وہ کتنا ہی عالم و فاضل ہو مگر اسرار و رموز کا احاطہ نہ کر سکنے کی وجہ سے حیرت ہی ملتی ہے یہ بھی یاد رہے یہ حیرت اسلامی عقائد و احکام میں نہیں۔

نے چنیں حیراں کہ پشتش سوئے اوست

بل چنیں حیراں کہ غرق و مست زوست

پہلے شعر میں طالب عارف کی حیرت کا ذکر کیا گیا ہے اس شعر میں عارف کی

حیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عارف تمام حیرتوں کے باوجود ایسا حیران نہیں ہوا کہ اس کی پیٹھ اس کی طرف ہو بلکہ ایسا حیران کہ اس کے خیال میں مستغرق اور مست ہو، اس شعر میں حیرت کی کیفیت کو بیان کر رہے ہیں یہاں حیرت سے مراد شک و وسوسہ والی حیرت نہیں یہاں حیرت سے مراد عارف کا کمال محویت مراد ہے کہ وہ فنا کی منزلوں سے گزرتا ہوا بقا تک پہنچ رہا ہے۔

آں یکے را رُوئے او شد سوئے دوست
ویں یکے را روئے او خود رُوئے اوست

اس شعر میں محبوب حیرت (پسندیدہ حیرت) کا ذکر کیا جا رہا ہے، جس حیرت میں استغراق کم ہو وہ دوسرا درجہ رکھتی ہے، محمودہ حیرت یہ ہے کہ اس میں کمال محویت ہوتی ہے یہاں تک کہ طالب مطلوب اور طلب میں امتیاز ہی رہتا ہے، اس عنوان کو کسی نے اس شعر میں سمو دیا ہے۔

کیسی طلب کہاں کی طلب کس لئے طلب
ہم ہیں تو وہ نہیں جو وہ ہے تو ہم نہیں

ایک اور شعر بھی اسی عنوان کی نمائندگی کرتا ہے

کیا کھلے ؟ جو کبھی نہ تھا پنہاں
کیوں ملے؟ جو کبھی جدا نہ ہوا

روے ہر یک مے نگر میدار پاس
بُو کہ گردی تو زخدمت بُو شناس

پچھلے اشعار میں عارف کیلئے حیرت کی دو قسموں کا ذکر کیا گیا ایک حیرت محمود اور دوسری ناقصہ، اس شعر میں فرمایا جا رہا ہے عارف کو چاہئے ان دونوں قسموں سے وابستہ رہے اور ملاقات و زیارت سے فائدہ اُٹھاتا رہے، دونوں قسموں کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھے ہوسکتا ہے اس نایاب اور حسین تعلق کی بدولت عرفان کی راہ نصیب ہو جائے۔

دِیدنِ دانا عبادتِ ایں بود
فتحِ ابوابِ سعادت ایں بود

فرماتے ہیں جیسے یہ بات متعارف ہے کہ اللہ والے کی زیارت کرنا عبادت ہے اور اس سے زائد کہ خوش نصیبی کے دروازے کھلتے ہیں ایسے ہی جب عارف پر حیرت طاری ہو تو اس پر بھی رحمات و برکات الٰہیہ کے دروازے کھل جاتے ہیں، شعر میں دانا کا لفظ موجود ہے اس سے مراد عالم باعمل بھی مراد ہے اور ولی کامل بھی مراد ہے جن کے دیکھنے سے خدا یاد آتا ہے۔

چوں بسے ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نشاید داد ست

اس شعر میں نیک و بد سچے اور جھوٹے اور حق و باطل کا فرق بیان فرماتے ہیں پہلے اشعار میں بیعت کرنے اور مرشد کامل سے وابستگی کا درس دیا گیا تھا اس شعر میں بیعت کے سلسلہ میں نہایت محتاط رہنے اور سوچ و فکر سے اس راہ کو اختیار کرنے کا درس ہے۔ فرماتے ہیں بہت سے شیطان بھی انسانوں کی شکلوں میں ہوتے ہیں کہیں

سوچ سمجھے بغیر کسی کی شکل وصورت کو دیکھتے ہی لٹو نہ ہو جائے ، یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ مرشد وشریعت مطہرہ کا پابند ہے اس کا ظاہر و باطن ملتا ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال رکھتا ہے۔

زانکہ صیّاد آورد بانگِ صفیر
تافریبد مرغ راں آں مرغ گیر

اس شعر میں مکار اور فریبی مرشد سے بچنے کی مثال دیتے ہیں کہ کبھی شکاری بھی پرندے کی آواز نکالتا ہے کہ کسی پرندے کو دھوکا دے کر جال میں پھنسا لے ایسے دھوکہ باز لوگوں سے بچنا چاہیئے ، جو سیدھے سادھے لوگوں کو صوفیوں کی شکل وصورت میں پھانس لیتے ہیں اور پھر ہمیشہ کیلئے گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیتے ہیں ایسے لوگ تو خود گمراہی کے گڑھے میں پڑے ہیں وہ کسی دوسرے کو کیا نکال سکتے ہیں ، جسمانی علاج کیلئے کسی ایسے طبیب کی ضرورت ہے جو خود بھی بیماریوں سے محفوظ ہو اگر وہ طبیب خود تو صحت مند ہے مگر اسے علاج کا طریقہ نہیں آتا پھر بھی ناکام ہے ایسے ہی شیخ و مرشد کیلئے ضروری ہے کہ وہ خود بھی متقی ہو، پرہیز گار ہو شریعت کا پابند ہو، اس کی تعلیم و تربیت میں انوار و برکات کا اثر ہو۔ جیسے ظاہری طبیب کیلئے دیکھا جاتا ہے کہ یہ کسی طبیب کے پاس رہا ہے اس نے علم طب پڑھا ہے کسی کامل طبیب سے تربیت حاصل کی ہے ایسے روحانی طبیب کیلئے دیکھا سوچا جائے ورنہ خطرہ ہی خطرہ ہے

بشنود آں مرغ بانگ جنس خویش
از ہوا آید بیابد دام و نیش

اسی عنوان کو مزید فرماتے ہیں کہ شکار ہونے والا پرندہ جب اپنے ہم جنس کی آواز کو سنتا ہے تو ہوا سے اتر آتا ہے اور قید میں پھنس جاتا ہے پھر سراسر قید ہی قید ہے، تباہی ہی تباہی، ایسے ہی کسی دھوکہ باز انسان فریبی شخص کی دل بہلانے والی آواز پر مست ہو کر اس کا نیاز مند نہ بن جائے اس کے اپنی شرعی معاملات کا جائزہ لے اور پھر ہوش وفکر سے اس کی قربت اختیار کر۔

حرف درویشاں بد زدو مرد دُوں
تا بخواند بر سلیمے زاں فسوں

فرماتے ہیں جیسے پرندہ اپنے ہم جنس کی آواز سن کر ہوا سے اتر آتا ہے اور جال میں پھنس جاتا ہے ایسے ہی سادہ لوح درویش دکھاوے اور مکر وفریب کرنے والے صوفی کے دھوکے میں آجاتا ہے اور جہالت کی قیدو بند میں پھنس جاتا ہے۔

کارِ مرداں روشنی و گرمی ست
کار دُوناں حیلہ و بے شرمی است

اہل حق نورِ عرفان کو پھیلانے والے تو آفتاب کی طرح ہیں جن کی روشنی اور گرمی عشق سے لوگ فیض یاب ہوتے ہیں، مکار اور کمینے لوگ تو مکروفریب کے داؤ پیچ سے لوگوں کو خدا اور رسول سے دور کرتے ہیں، مولانا نے سچے مرشد کی نشاندہی روشن آفتاب کی مثال سے دی ہے، ایسے افراد متقی، پرہیزگار، اہل علم، شریعت کے پابند ہوتے ہیں لوگوں کی اصلاح کرتے ہیں، مکار لوگ تو مال ودولت کی طلب میں بے حیائی کے جذبات تک پہنچ جاتے ہیں اللہ ایسے سرکش، نافرمان لوگوں کی صحبت سے بچالے اور حفاظت فرمائے۔

شیر پشمیں از برائے گد کنند
بو مُسَیلم را لقب احمد کنند

اس شعر میں مکار جھوٹے اور فریبی لوگوں کی مثال فرماتے ہیں یہ لوگ ایسے ہی ہیں جیسے بھیک مانگنے کیلئے مصنوعی شیر بنا کر بھکاری در در بدر مانگتے ہیں اور لوگ مسیلمہ کذاب کا لقب احمد مشہور کر دیتے ہیں، پشم کا شیر حقیقی شیر تو ہے نہیں محض مصنوعی ہے دکھاوا ہے نہ اس میں شیر کی آواز ہے نہ طاقت ہے بلکہ محض بھیک مانگنے کا بہانہ ہے یہی صورت حال دکھاوے کے صوفیوں کی ہے شکل، دستار، تسبیح، جبہ محض مال و دولت اکٹھا کرنے کی غرض سے ہے ان لوگوں میں حق و صداقت کا نام ونشان ہی نہیں، خدا سے قریب کرنے کی بجائے لوگوں کو سرکش باغی بنا دیتے ہیں۔

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں بومسیلم کا ذکر ہے اس سے مراد مسیلمہ کذاب ہے جس نے حضور ﷺ کے زمانہ پاک میں پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا اور اپنے حواریوں کے بل بوتے پر ملک یمامہ میں ایک حکومت قائم کر لی تھی پھر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ پاک میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔

بو مسیلم را لقب کذاب ماند
مر محمد را اولوالالباب ماند

فرماتے ہیں جھوٹ بالآخر جھوٹ ہی ہوتا ہے مسیلمہ نے جھوٹا دعویٰ کیا وہ جھوٹ ہی رہا آخر بُری طرح رُسوا و ذلیل ہو کر مار کھا گیا، مسیلمہ کی مخالفت دشمنی کے باوجود حضور ﷺ کے مقام عظمت میں کوئی فرق نہ آیا یہی حالت مکار جھوٹے لوگوں کی

ہے ان کے مکر وفریب اور حیلوں بہانوں سے اہل حق اولیاء اللہ کے مقام عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

آن شراب حق ختامش مشکناب
بادہ را ختمش بود گند و عذاب

پہلے شعر کی تائید میں فرماتے ہیں مسیلمہ کی مخالفت کے باوجود حضور ﷺ کا کچھ نہ بگڑا اور خود مسیلمہ رُسوا ہو گیا، حضور ﷺ تو شراب حق ہیں جس کی مہک نے کائنات کو معطر کر رکھا ہے، باہر سے خوشبو ہے اور اندر سے عشق و مستی کی لپیٹیں ہیں اور مسیلمہ کذاب کی حالت یہ ہے کہ باہر سے بدبو ہے جس سے دل و دماغ پریشان ہوتے اور اندر سے قیامت کے دن عذاب ہی عذاب ہے، حضور ﷺ کے ارشادات گرامی سے مہک پھیلتی ہے باطن کے اثر سے عشق و مستی کی لہریں پھوٹتی ہیں۔

ایک یہودی بادشاہ کا واقعہ جو عیسائیوں کا قاتل تھا

اس سے پہلے اشعار میں مکر وفریب سے لوگوں کو بہکانے والوں کا ذکر تھا جنہیں صوفی مشن کی ہوا بھی نہیں لگی مگر انہوں نے درویشوں کے کلام چوری کر کے اپنے کو صوفیاء کی فہرست میں شامل کیا، اسی عنوان سے ہی یہ داستان وابستہ ہے کہ ایک یہودی وزیر نے عیسائیوں کو دھوکہ دے کر ان کا رہبر و راہنما بن گیا اور ان کے دین و دنیا دونوں کو برباد کر دیا۔

بودشاہے در جہوداں ظلم ساز
دشمنِ عیسیٰ و نصرانی گداز

اس ظالم بادشاہ اور عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ہی تھا عیسیٰ علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے پیار رکھتے تھے اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ نبوت ختم ہو چکا تھا اور یہ دور عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت مطہرہ کا تھا مگر عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت مطہرہ موسیٰ کی شریعت سے متضاد نہ تھی یہ یاد رہے تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی دین ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "نحن معشر الانبیاء ابونا واحد و امھاتنا شتی "ہم انبیاء کا گروہ ہیں ہم سب کا باپ ایک ہے مائیں مختلف ہیں یعنی دین سبھی کا ایک ہے البتہ شریعتوں میں تھوڑے بہت مسائل مختلف ہیں، نماز، روزہ، حج زکوٰۃ یہ بنیادی مسائل سبھی کے ہیں البتہ ادائیگیوں کے انداز میں تھوڑا بہت فرق رہا یہ پیغمبر موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام تو ایک دوسرے کی جان تھے۔

شاہِ احول کرد در راہِ خدا
آں دو دمساز خدائی را جدا

اس یہودی ظالم بادشاہ نے موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام دونوں کو اللہ کی راہ سے الگ الگ تصور کر لیا اسی وجہ سے وہ ظالم بادشاہ موسیٰ علیہ السلام کی حمایت میں عیسیٰ علیہ السلام کے معتقدین پر ظلم ڈھانے لگا اس شعر میں اس ظالم بادشاہ کو احول کہا گیا ہے کہ بادشاہ چشم بصیرت سے بھینگا تھا کہ دونوں پیغمبر جو نبوت و رسالت میں خدا تک پہنچانے میں ایک تھے اس نے الگ الگ تصور کر لئے ، ایک کی تصدیق کرتا تھا

دوسرے کی تکذیب حالانکہ انبیاء ورسل کے ایک ہونے کے متعلق قرآن مقدس فرماتا ہے"لا نفرق بین احد من رسلہ"

گفت استاد احولے را کاندرا
رو بروں آر از وثاق آں شیشہ را

اس مسئلہ کو ایک بھینگے شاگرد کا ذکر کر کے سمجھاتے ہیں کہ استاذ نے اپنے ایک بھینگے شاگرد سے کہا جاؤ اندر سے وہ بوتل لے آؤ، فرماتے ہیں

چوں دروں خانہ احول رفت زُود
شیشہ پیش چشم او دو مینمود

جب وہ بھینگا شاگرد مکان کے اندر گیا تو اس کو ایک بوتل کی جگہ دو بوتلیں دکھائی دیں

گفت احول زاں دو شیشہ تا کدام
پیش تو آرم بکن شرحے تمام

اس بھینگے شاگرد نے استاد سے کہا اچھی طرح بتاؤ اُن دونوں شیشوں میں سے کونسا شیشہ لاؤں۔

گفت اُستاد آں دو شیشہ نیست رو
احولی بگداز افزوں بیں مشو

بھینگے شاگرد نے اُستاذ سے کہا آپ مجھے طعنہ دے رہے ہیں میں تو سچ کہہ رہا ہوں شاگرد کے جواب میں استاد نے کہا اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو دونوں

بوتلوں سے ایک کو توڑ ڈالو۔ شاگرد نے عمل کیا

چوں یکے بشکست ہر دو شد زچشم
مردِ احول گردد از میلان و حشم

جب بھینگے شاگرد نے ایک بوتل کو توڑا تو دونوں ہی اس کی نظر سے غائب ہو گئیں۔

حضرت مولانا نے بھینگے کی مثال سے اپنے موقف کو مضبوط کیا ہے کہ یہ بھینگا ایک بوتل کو دو سمجھا اور ایک کو توڑنے کے خیال میں دونوں کو ختم کر دیا یہ یہودی بادشاہ بھی حقیقت میں مذہبی طور پر بھینگا ہی تھا کہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) حقیقتاً ایک ہی تھے دین ایک تھا، خدا ایک تھا، نبوت ایک تھی اس یہودی بادشاہ نے ایک کو دو سمجھا اور موسیٰ علیہ السلام کی حمایت میں عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کر دی اور یہ نہ سمجھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار موسیٰ علیہ السلام کا انکار ہے ایک دین کو دو سمجھا ایک کا انکار کیا تو دونوں نبیوں کی برکات سے محروم ہو گیا۔

مولانا اس مثال سے بتا رہے ہیں اسی طرح آدمی شہوت و غضب سے احول اور غلط بیں ہو جاتا ہے جیسے ایک شیشہ کے توڑنے سے دونوں ختم ہو گئے ایسے ہی ایک نبی کے انکار سے سارے نبیوں کا انکار ہو جاتا ہے یہ بھینگا آدمی عیسیٰ علیہ السلام کے انکار سے دونوں نبیوں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی برکات سے محروم ہو گیا۔

شیشہ یک بود بچشمش دو نمود
چوں شکست آں شیشہ را دیگر نبود

بوتل حقیقت میں ایک تھی احول کی نظر نے دو سمجھیں جب اُس نے ایک بوتل کو توڑا تو دوسری بھی نہ تھی۔

خشم و شہوت مرد را احول کند
ز استقامت روح را مبدل کند

پہلے اشعار کی ہی تشریح فرماتے ہیں کہ غصہ اور شہوت آدمی کو احول (بھینگا) بنادیتے ہیں اور روح کو ٹیڑھی راہ پر چلا دیتے ہیں۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد
صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

جب دل پر نفسانی خواہشات چھا جائیں تو دل کے معاملات بھی غلط ہو جاتے ہیں کہ تمام حواس اعضاء دل کے تابع ہوتے ہیں اور دل کمانڈر ہے جس حس اور عضو کو جو کہتا ہے وہ وہی کرتا ہے۔

چوں دہد قاضی بدل رشوت قرار
کے شناسد ظالم از مظلوم زار

پہلے شعر کی مزید وضاحت فرماتے ہیں جب کوئی حکمراں رشوت لینے کا منصوبہ بنالے تو وہ ظالم و مظلوم میں کیا فرق کر سکے گا ایسے ہی اگر دل مفسدات کی طرف مائل ہو جائے تو جسم کے باقی سارے اعضاء اس کی تعمیل میں پھنس کر بربادی کا سبب بن جائیں گے جیسے کسی منصف کے دل پر شہوت و غضب چھا جائیں تو وہ

انصاف نہیں کر سکتا۔

شاہ از حقدِ جہودانہ چناں
گشت احوال الاماں یارب اماں

فرماتے ہیں یہ یہودی بادشاہ بھی غضب حسد کی آگ سے احول بھینگا ہو گیا کہ خدا پناہ عیسائیوں کے قتل میں ملوث ہو گیا، ایک نبی کے بغض نے اسے حق سے بہکا دیا۔

صد ہزاراں مومن مظلوم کشت
کہ پناہم دین موسیٰ راؤ پشت

اس ظالم یہودی بادشاہ نے ہزاروں عیسائی ظلم سے قتل کر دئے محض اس خیال میں کہ میں موسیٰ کے دین کی حفاظت کرر ہا ہوں اس یہودی بادشاہ نے عیسائیوں کے قتل کو موسیٰ علیہ السلام کی مدد کرنا سمجھا، حالانکہ اس کے اس کام سے موسیٰ علیہ السلام کا جھٹلانا واضح ہو رہا ہے کہ ایک نبی کی تکذیب سب کی تکذیب ہے۔

او وزیرے داشت رہزن عشوہ دہ
کو بر آب از مکر بر بستے گرہ

فرماتے ہیں اس ظالم یہودی بادشاہ کا ایک وزیر تھا جو نہایت مکار دھوکہ باز اور چالاک تھا اس کی ہوشیاری مکاری کا یہ عالم تھا کہ پانی میں گرہ لگا لیتا تھا یعنی دھوکہ بازی میں مشہور تھا پانی میں گرہ لگانا بہت مشکل ہے مگر ایسے مشکل سے مشکل کام بھی کر جانتا تھا۔

گفت تر سایاں پناہِ جاں کنند
دینِ خود را از ملک پنہاں کنند

اس عیار وزیر نے بادشاہ سے کہا کہ بادشاہ سلامت عیسائی قتل سے ڈرتے ہوئے اپنا مذہب چھپا کر بچ جائیں گے اور بادشاہ سے کہا انہیں قتل نہ کرو اور ان کی خونریزی چھوڑ دو۔

کم کش ایشاں را کہ کشتن سود نیست
دیں ندارد بوئے مشک و عود نیست

وزیر نے کہا بادشاہ ان عیسائی لوگوں کو قتل نہ کر کہ ایسا کرنا فائدہ مند نہیں دین کوئی مشک عنبر تو نہیں کہ اس کی خوشبو یا مہک ہے جسے سونگھ کر معلوم کر لیا جائے کہ اس کا یہ دین ہے اگر عیسائی بظاہر تمہارا دین قبول کر لیں اور دل میں اپنے مذہب پر رہیں تو پھر کیا کرو گے۔

سرّ پنہاں ست اندر صد غلاف
ظاہرش با تُست و باطن بر خلاف

مکار وزیر نے کہا بادشاہ کا دین تو پردوں کے اندر ایک چھپا ہوا راز ہے جس کا ظاہر تیرے موافق ہے اور باطن تیرے خلاف ہے۔

شاہ گفتش پس بگو تدبیر چیست
چارۂ ایں مکرو ایں تزویر چیست

بادشاہ نے وزیر سے کہا پھر بتا کیا تدبیر کی جائے اس مکروفریب کا علاج کیا ہے، میں چاہتا ہوں دنیا میں کوئی عیسائی نہ بچ سکے، کُھلا یا چھپا کوئی عیسائی نظر ہی نہ آئے۔

تا نماند در جہاں نصرانئے
نے ہویدا دین و نے پنہانئے

بادشاہ نے وزیر سے کہا کوئی ایسی تدبیر کرو کہ دنیا میں نہ کوئی ظاہر دین والا عیسائی رہے نہ پوشیدہ والا سبھی ہلاک ہوجائیں۔

گفت اے شاہ گوش در ستم را ببر
بینم بشگاف و لب از حکم مُر

وزیر نے بادشاہ سے کہا عیسائیوں کو گمراہ کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ میرے ہاتھ کان کاٹ دے یا چیر دے پھر مجھے سولی کے نیچے لاؤ لوگوں کو پتہ چلے مجھے سولی پر چڑھایا جارہا ہے پھر کوئی میری سفارش کرکے مجھے آپ سے چھڑالے۔

بر منادی گاہ کن ایں کار تو
برسرِ راہے کہ باشد چار سو

وزیر نے کہا یہ سارا کام کسی عام جگہ پر ہونا چاہئے جہاں چاروں طرف سے لوگ آجارہے ہوں عام چورستہ ہو۔

آنگہم از خود براں تا شہر دُور
تا در انداز در ایشاں صد فتور

پھر مجھے کسی دور شہر میں نکال دیا جائے تا کہ میں عیسائی لوگوں میں اچھی طرح فتنہ ڈال سکوں اور سینکڑوں فسادات ڈال سکوں۔

چوں شوند آں قوم از من دین پذیر
کار ایشاں سر بسر شوریدہ گیر

جب وہ لوگ میری کسمپرسی اور پریشان حالت کو دیکھیں گے اور تیری طرف سے مجھ پر زیادتی کا جائزہ لیں گے تو مجھے اپنے دین کا نمائندہ مان لیں گے، میری باتوں پر عمل کریں گے اور مجھے اپنا رہنما مان لیں گے تو پھر یہ سارا کام ہو جائے گا۔

درمیاں شاں فتنہ و شور افگنم
کاہر من حیراں شود اندر فتم

وزیر نے کہا اب میں ان میں ایسا فتنہ ڈالوں گا کہ شیطان بھی میری کاروائی دیکھ کر حیران رہ جائے گا۔

آنچہ خواہم کرد با نصرانیاں
آں نمی آید کنوں اندر بیاں

اور جو کچھ میں عیسائیوں کا حشر کروں گا وہ اس وقت بیان نہیں کر سکتا کہ کہیں یہ راز کھل نہ جائے اور تدبیر ناکام ہو جائے یا یہ معنی ہے عیسائیوں کی ہونے والی حالت

جو بربادی اور تباہی ہے وہ بیاں نہیں کرسکتا۔

چوں شمارندم امین و راز داں
دام دیگر گوں نہم در پیش شاں

جب وہ لوگ (عیسائی) مجھے امین دیانتدار اور راز دار سمجھنے لگیں گے تو پھر ان کو کسی اور مکر وفریب میں لاؤں گا۔

وز حیل بفریبم ایشاں را ہمہ
و اندر ایشاں افگنم صددمدمہ

وزیر نے بادشاہ سے کہا میں اپنے مکر وفریب سے سب کو دھوکا دوں گا اور سینکڑوں مشکلات میں ڈال دوں گا۔

تا بدست خویش خون خویشتن
بر زمین ریزند کوتہ شد سخن

پہلے شعر میں تھا کہ وزیر نے کہا میں مکر وفریب سے انہیں سینکڑوں ہلاکتوں میں مبتلا کر دوں گا، اس میں اسی کی تائید ہے کہ میرے مکر وفریب سے نصاریٰ اپنی جانیں ضائع کر دیں گے زمین پر خون بہا دیں گے۔

عیسائیوں میں جنگوں کا آغاز

مولانا رومی علیہ الرحمہ کے اس قصہ کا ذکر علامہ بغوی کی ایک تحریر سے بھی ملتا ہے جس تحریر کو قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی علیہ الرحمہ نے بھی نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی نے اس طرح نقل کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد دیر تک عیسائی دین پر پابندی سے قائم رہے اور یہودی انہیں تنگ کرتے رہے، ایک مشہور یہودی بولس نامی نے فتنہ پیدا کرنے کیلئے اپنے گھوڑے کی ٹانگیں کاٹ دیں اپنے سر پر مٹی ڈالی، مظلومانہ سی صورت بنالی، لوگوں نے پوچھا ایسا کیوں کیا تو بولس نے کہا مجھے غیب سے آواز آئی ہے کہ جب تک تم عیسائی نہ بن جاؤ گے تمہاری توبہ قبول نہیں ہوگی، اسی وجہ سے میں نے یہودی مذہب چھوڑ دیا ہے، عیسائی اسے اپنے گرجا میں لے آئے، اس کی خاطر مدارت شروع کردی اور یہ بولس ہر وقت انجیل کی تلاوت میں مصروف رہتا پھر اس نے دوسرا اعلان کیا کہ اب میری توبہ قبول ہوگئی ہے نصاریٰ نے اسے اپنا رہبر و راہنما بنالیا پھر اس بولس نے عیسائیوں میں تبلیغ شروع کردی کہ عیسیٰ، مریم، اللہ یہ تینوں ایک ہی ہیں ان کی یہ اصطلاح باپ، بیٹا، روح القدس کے ناموں سے آج بھی چل رہی ہے، بولس کے اس نظریہ کو نصاریٰ کے دو مشہور بندوں نطور اور یعقوب نے خوب پھیلایا پھر اس عقیدہ کو نشر کیا، عیسیٰ ازلی ابدی خدا ہے، ان دونوں بندوں سے کہا تم میرے جانشین ہو اس تبلیغ کو عام کرتے رہنا، اب میں صبح کو عیسیٰ علیہ السلام پر اپنی جان قربان کروں گا تاکہ وہ مجھ سے راضی ہو، چنانچہ اگلے دن ہی اس بولس نامی شخص نے خودکشی کرلی، اب اس کے کفن دفن کے بعد عیسائیوں میں

جھگڑے شروع ہو گئے کہ بولس کا اصل خلیفہ کون ہے اسی بات پر عیسائیوں میں جھگڑا فسادات اور خونی جنگیں ہوئیں۔

پس بگوید من پسر نصرانیم
اے خدائے راز داں میدانیم

اس مکار وزیر نے کہا میں عیسائی ہوں اور قسم کھالوں گا کہ اے خدائے قدوس تو مجھے جانتا ہے۔

شاہ واقف کشت از ایمان من
وز تعصب کرد قصد جانِ من

کسی وجہ سے بادشاہ میرے مذہبی عقیدہ سے واقف ہو گیا اور تعصب سے میری جان لیوا ہو گیا۔

خواستم تا دیں ز شہ پنہاں کنم
آنچہ دین او ست ظاہر آں کنم

میں نے چاہا کہ بادشاہ سے اپنا دین چھپاؤں اور جو دین اس کا ہے وہ بتاؤں

شاہ بوئے برد از اسرار من
متہم شد پیش از گفتار من

میرا تو اِرادہ تھا کہ شہ سے راز چھپاؤں مگر بادشاہ نے میرے بھید کا سراغ لگا لیا اور میں بادشاہ کے سامنے جھوٹا ہو گیا۔

اس مکر وفریب کا مطلب یہ ہے کہ جب میرا یہ حال ہوگا تو میں نصرانیوں سے کہوں گا میں اندر سے تو عیسائی ہوں اور اس پر قسم کھالوں گا مگر بادشاہ کسی طرح میرے دین سے واقف ہو گیا اور تعصب کی وجہ سے میری جان مارنے کا فیصلہ کرلیا اور میرا زبانی دعویٰ اس کے سامنے غلط ہو گیا اور کہا تیری بات اس طرح چبھتی ہے جیسے روٹی میں سوئی چھپا دی جائے تو وہ نظر تو نہیں آئے مگر کھانے والے کو شدید محسوس ہو جائے گی، ایسے ہی تیرے دعویٰ میں جھوٹ کھٹکھتا ہے میں نے تیری اصلی حالت کو دیکھ لیا ہے تیرے مزاج کو سمجھ گیا ہوں، تیرا حال دیکھ لیا ہے اب تیری باتوں پر یقین نہیں ہوسکتا یہ سارا مضمون وزیر کا ہے کہ نصرانیوں سے یہ باتیں کروں گا۔

گفت گفت تو چوناں در روغن است
از دلِ من تا دلِ تو روزن است

بادشاہ نے کہا تیری بات بظاہر تو ایسی ہے جیسے روغنی روٹی ہوتی ہے اچھی ہے چکنی ہے مگر تیرے اندر کی حالت مجھے معلوم ہے اس لئے کہ تیرے دل سے میرے دل تک ایک روشندان ہے جس سے سب کچھ واضح ہو رہا ہے۔

من ازاں روزن بدیدم حال تو
حال دیدم کے نیو شم قال تو

بادشاہ نے وزیر سے کہا میں نے تیرا حال اس راستہ سے اچھی طرح دیکھ لیا ہے جب میں نے تیرا حال دیکھ لیا ہے تو اب تیری باتیں کیوں سنوں۔

گر نبودے جان عیسیٰ چارہ دام
او جھودانہ بکر دے پارہ ام

وزیر نے کہا پھر میں اُن نصرانیوں سے کہوں گا اگر عیسیٰ علیہ السلام کی روح میری مدد نہ کرتی تو وہ یہودیوں کی طرح مجھے پارہ پارہ کر دیتا۔

بہرِ عیسیٰ جان سپار سر دہم
صد ہزاراں منتش بر جان نہم

مگر مجھے اپنی جان کا کوئی ڈر نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کیلئے جان دینے اور سر رکھنے کو تیار ہوں اگر ایسا ہو تو اپنی جان پر لاکھوں احسان مانوں گا۔

جاں دریغم نیست از عیسیٰ ولیک
واقفم بر علم دینش نیک نیک

مجھے عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر جان دینے سے کوئی ڈر نہیں لیکن میں اُن کے دین سے بہت زیادہ واقف ہوں کہ لوگوں کو بے دین دیکھنا مجھے بہت ناپسند ہے۔

حیف مے آید مرا کاں دینِ پاک
درمیانِ جاہلاں گردد ہلاک

مجھے افسوس ہے یہ دین جاہلوں میں پڑ کر برباد ہو رہا ہے۔

شکر یزداں راؤ عیسیٰ را کہ ما
گشتہ ایم ایں دین حق و راہنما

اللہ کا شکر ہے کہ ہم اس سچے دین کے راہنما بن گئے ہیں۔

پچھلے چند اشعار سے وزیر کا مضمون آ رہا ہے وہ کہتا ہے میں عیسائیوں سے کہوں گا اگر عیسیٰ علیہ السلام میری مدد نہ کرتے تو یہودی بادشاہ مجھے ہلاک کر دیتا میں تو عیسیٰ علیہ السلام کیلئے جان کی قربانی دینے کو آمادہ ہوں بلکہ جان دے کر عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے پر احسان مانوں گا کہ میری جان قبول ہوگئی عیسیٰ علیہ السلام کو جان دینے سے مجھے دریغ نہیں۔

دور دور عیسیٰ است اے مرد ماں
بشنوید اسرار کیش او بجاں

اے لوگو! یہ دور تو عیسیٰ علیہ السلام کا ہے ان کے مذہب کے راز دل و جاں سے سنو۔

کایں شہ بیدین و ظالم بس عدو ست
مے نداند ہیچ دشمن راز دوست

یہ بے دین بادشاہ عیسائیوں کا بڑا دشمن ہے اور اس قدر بدتمیز ہے کہ دوست دشمن میں امتیاز ہی نہیں کرتا۔

ایں نسق میگفت با نصرانیاں
لیک بودش دل بسوئے شہ کشاں

اس شعر میں اس مکار وزیر کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ وزیر نصرانیوں کے سامنے بادشاہ کو سناتا تھا مگر وہ وزیر دل سے بادشاہ کا خیر خواہ تھا۔

گفت شہ را کائے شہنشہ صبر کن
تا من ایشاں را کنم از بیخ و بُن

وزیر نے کہا بادشاہ آپ دیکھتے رہیں میں کس طرح ان لوگوں کو برباد کرتا ہوں ان کی جڑیں اکھاڑ دوں گا۔

چوں شمارند امین و مُقتدا
سرنہندم جملہ جویند اہتدا

جب وہ عیسائی مجھ کو اپنا امین اور رہنما سمجھیں گے تو میرے آگے سرِ تسلیم خم کریں گے اور ہدایت طلب کریں گے۔

چوں وزیر آں مکر را بر شہ شمرد
از دلش اندیشہ را کلی ببرد

جب وزیر نے بادشاہ کے سامنے یہ مکر بیاں کیا تو بادشاہ کے دل سے فکر ختم ہو گیا۔

کرد باوے شاہ آں کاریکہ گفت
خلق حیراں ماند زاں راز نہفت

بادشاہ نے وہی کام کیا جو اس نے کیا تھا اس پوشیدہ راز سے لوگ حیران رہ گئے۔

کرد رسوائیش میان انجمن
تا کہ واقف شد زحالش مرد و زن

اُسے سر بازار رسوا کیا یہاں تک لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے۔

راند اورا جانب نصرانیاں
کرد در دعوت شروع او بعد ازاں

اس مکار وزیر کو نصرانیوں کی طرف بھگا دیا اس کے بعد اس نے مذہبی پروگرام شروع کر دیا۔

چوں چناں دیدند ترسا نالش زار
مے شدند اندر غم او اشکبار

عیسائیوں نے جب وزیر کو اس حالت کسمپرسی میں دیکھا تو وہ اس کے فریفتہ ہو گئے اور اس کی حالت پر رونے لگے۔

حال عالم ایں چنیں ست اے پسر
از حسد می خیزد اینہا سر بسر

اس شعر میں وزیر کی مکاری کا نتیجہ بیان کرتے ہیں کہ دنیا کا حال اسی طرح ہے جیسا وزیر نے عیسائیوں کو برباد کرنے کیلئے اپنا حال بنایا یہ ساری باتیں حسد سے اٹھتی ہیں۔

حسد کی مذمت

اس آخری شعر میں حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ نے حسد کی مذمت فرمائی ہے کہ حسد ایک خوفناک بیماری ہے جو بندے کو برباد کر دیتی ہے۔ یہ بات یاد رہے جیسے جسم میں کئی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں ایسے ہی دل میں بہت سی بیماریاں پیدا ہو

جاتی ہیں دل کی ساری بیماریوں سے مہلک اور خطرناک بیماری بدعقیدگی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کے بارہ میں غلط نظریات پیدا ہو جائیں ، یہی بیماری بدعقیدگی کہلاتی ہے جو تباہی اور بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

اس مہلک بیماری سے بچنے کا حسین راستہ یہ ہے، رب قدوس فرماتا ہے ''کونوا مع الصادقین '' سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ، وہ اہل اللہ ہیں اولیاء کاملین میں مولانا رومی علیہ الرحمہ نے اپنی اس کتاب مثنوی شریف میں مختلف انداز میں اسی راستہ پر چلنے کا درس دیا ہے، نبوت کا دروازہ تو بند ہو گیا، اب قیامت تک اہل اللہ آتے رہیں گے اور اس راستہ پر لوگوں کو چلاتے رہیں گے۔

حسد کی بیماری کا آغاز شیطان سے ہوا، اس نے عظمت آدم علیہ السلام پر حسد کیا اس بیماری کے متعلق حضور ﷺ کا ارشاد ملتا ہے حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمہ نے احیاء العلوم میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، ایک دن حضور ﷺ صحابہ سے فرماتے ہیں آج ایک جنتی تمہارے سامنے آئے گا چنانچہ ایک انصاری گزرے، دوسرے دن بھی وہی تیسرے دن بھی وہی گزرے، حضرت عبداللہ ابن عمران کے پیچھے گئے کہ پتہ کریں کس عمل صالح کی بناء پر یہ جنتی ہیں ان کے گھر گئے پوچھا آپ کا عمل کیا ہے، کہ آپ کو حضور ﷺ نے جنتی فرمایا تو جواب دیا کوئی خاص عمل تو نہیں البتہ ایک بات ہے کیا بعید اسی کی وجہ سے یہ انعام ملا ہو وہ بات یہ ہے مجھے کبھی کسی پر دل میں حسد نہیں آتا۔

حضور ﷺ نے ایک موقعہ اس بیماری سے بچنے کیلئے اس طرح ارشاد فرمایا ''لاتحاسدوا ولا تقاطعوا ولا تباغضوا و کونوا عباد اللّٰہ اخوانا '' ایک دوسرے

سے حسد نہ کرو، بغض نہ کرو اللہ کے خاص بندے ہو جاؤ اور بھائی بھائی بن کر رہو۔
حضور سید عالم ﷺ کا ایک ارشاد اس طرح ملتا ہے مجھے اپنی اُمت پر زیادہ خوف اس بات کا ہے کہ اس کے پاس مال کی کثرت ہو اور آپس میں حسد کر کے کشت وخون کریں اس خطرناک بیماری کا علمی علاج یہ ہے کہ حاسد تقدیر خداوندی کا قائل ہو اور یہ یقین کر لے کہ اس کی تدبیر تقدیر کو بدل نہیں سکے گی۔

صدر ہزاراں مرد تر سا سوئے او
اندک اندک جمع شد در کوئے او

مکار وزیر کی مکاری سے لوگ متأثر ہو گئے اور تھوڑے تھوڑے جمع ہو کر قوت بن گئے۔

او بیاں مے کرد با ایشاں فصیح
دائما اقوال و افعال مسیح

یہ مکار اور فریبی وزیر عیسائیوں سے بڑی فصاحت اور اچھے انداز میں عیسیٰ علیہ السلام کے قول وفعل کے تذکرے کرتا۔

او بظاہر واعظ احکام بود
لیک در باطن صفیر و دام بود

اس وزیر کا ظاہر تو بڑا صاف تھا واعظ تھا احکام سناتا لوگوں کو گرویدہ کر لیتا تھا مگر اندر پلید تھا، سیٹی اور جال کا کام کرتا تھا یہ شخص اخلاص کی دولت سے محروم تھا، اِخلاص ہی وہ قیمتی شے ہے جس سے روح چمکتی ہے دوسرے لفظوں میں اسے تقویٰ کہہ لیں۔

تقویٰ کا انتہائی معیاری مقام اخلاص ہے جس سے دل کا شیشہ چمک اٹھتا ہے۔

عاشق آئینہ باشد روئے خوب
صیقل جان آمد از تقوی القلوب

حسین آدمی ہی شیشہ دیکھنے کا شوقین ہوتا ہے، بدصورت آدمی اپنے آپ کو دیکھنے میں شوق نہیں رکھتا اور یہ شیشہ دلوں کے تقویٰ سے ہی نصیب ہوتا ہے۔ عبادات وریاضات کی قبولیت اخلاص سے ہی ہے۔ حدیث شریف میں ہے قیامت کے دن شہید سے پوچھا جائے گا تو دنیا میں کیا کرتا تھا، وہ کہے گا تیری راہ میں شہید ہوا میرا خون بہا، اعضاء کاٹے گئے، حکم ہوگا اسے دوزخ میں ڈالو عرض کرے گا یا اللہ کیوں؟ حکم ہوگا لڑنے مرنے میں تیرا خلوص نہیں تھا، تیرا نظریہ تھا مر گیا کٹ گیا تو لوگ شہید کہیں گے بچ گیا تو غازی ہوں گا۔ یہی کیفیت عالم کی ہوگی، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے اللہ رب العزۃ جل مجدہٗ کی ذات میں فنا ہو جانا اخلاص کا بلند مقام ہے۔

بہر ایں معنی صحابہ از رسول
ملتمس بودند مکر نفس غول

اس شعر میں مولانا وزیر کی مکاری عیاری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں جیسے اس مکار وزیر نے عیسائیوں کو اپنے مکروفریب سے تباہ کرنا چاہا تھا ایسے ہی انسان کے اندر نفس بھی ہے جو انسان کا دشمن ہے اور اس کی بربادی کیلئے ہر لحظہ تدبیر کرتا رہتا ہے۔ فرماتے ہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور ﷺ سے اس نفس کی مکاریوں کے متعلق پوچھتے رہتے تھے جیسے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ملتا ہے لوگ

حضور ﷺ سے خیر کے متعلق سوال کیا کرتے تھے اور میں شر کے متعلق پوچھا کرتا تھا اس سے ڈرتا رہتا تھا کہیں نفس کا شر فریب مجھے برباد نہ کر دے۔ نفس کے شر سے بچنے کیلئے روزہ کی عادت بہترین علاج ہے۔ صوفیاء کرام نے اپنے نفوس کی اصلاح کیلئے روزہ کا علاج بہترین علاج قرار دیا ہے۔ شیخ الاسلام حضرت بابا فرید الدین علیہ الرحمہ کی حیات پاک میں روزہ کی کثرت پائی جاتی ہے اور آپ کے عقیدتمندوں نے بھی اپنے نفوس کی بہتری کیلئے اس علاج کو اہمیت دی ہے۔ صوفیاء میں اصلاح نفس کا اہم مرحلہ پیٹ بھر کر کھانے سے بچنا ہے۔ بھوکا رہنے سے نفس کی سرزنش ہوتی ہے، حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحہ فرماتے ہیں، مجاہدات ریاضات میں بھوک کو اہم مقام حاصل ہے کہ اس میں نفس کو ادب سکھانا ہے، پیٹ بھر کر کھانا شہوات کو فروغ دیتا ہے۔ احیاء العلوم شریف میں امام غزالی علیہ الرحمہ نے اس عنوان پر بہت کچھ لکھا ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں بھوکا رہنے والا مجاہد کا درجہ رکھتا ہے اور بھوک سے کوئی بہتر عمل نہیں، فرماتے ہیں آسمان کے فرشتے اس شخص کے پاس بالکل نہیں آتے جس نے اپنا پیٹ بھر کر عبادت کا مزہ ضائع کر دیا۔ امام غزالی نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کیا ہے، آپ فرماتے ہیں میں جب سے ایمان لایا ہوں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تاکہ اپنے رب کی عبادت کا مزہ حاصل کر سکوں۔

کوچہ آمیزد ز اغراض نہاں
در عبادتہا و در اخلاص جاں

اس شعر میں نفس کی برائی کا ذکر فرماتے ہیں کہ نفس عبادات میں اور اخلاص

میں بہت سی خودغرضیاں ملا کر عبادات وریاضات کو بے معنی کر دیتا ہے اور بندے کو مخلصین کے زمرہ سے نکال دیتا ہے نفس کے مکروفریب بہت گہرے ہوتے ہیں۔

فضلِ طاعت نجستندے ازو
عیب باطن را بجستندے کہ گو

اس شعر میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایک عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام حضور ﷺ سے اعمال صالحہ کی خوبیوں پر تبصرہ کم کرتے تھے، بلکہ باطن کی برائیوں اور نفس کی سازشوں کے متعلق زیادہ عرض کیا کرتے تھے۔

مُو بمو و ذرہ ذرہ مکر نفس
میشنا سیدند چوں گل از کرفس

صحابہ کرام کے انداز عمل کو بیان فرمارہے ہیں کہ صحابہ کرام حضور ﷺ کے فیض وکرم سے نفس کے چھوٹے سے چھوٹے مکروفریب اس طرح پہچان لیتے تھے جس طرح پھول کی خوشبو کو بد بو سے پہچان لیا جاتا ہے۔

گفت زاں فصلے حذیفہ باحسن
تابداں شد وعظ و تذکیرش حسن

اس شعر میں نفس کے مکروفریب سے بچنے اور اپنے اعمال کی اصلاح کیلئے عملی طور پر ایک مثال بیان فرمارہے ہیں۔ حضرت حسن بصری اپنے وعظ تبلیغ اشاعت دین کے سلسلہ میں بہت مشہور تھے، مولانا فرماتے ہیں حسن بصری کا یہ انداز تبلیغ اور

اصلاح نفس کی باتیں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے بالواسطہ سنی ہیں انہیں کا فیض تازیست عوام میں نشر کرتے رہے۔ امام غزالی علیہ الرحمہ نے احیاء العلوم کتاب العلم وساوس کے باب میں فرماتے ہیں خواجہ حسن بصری کے کلام سے انبیاء علیہم السلام کے کلام کی مہک محسوس ہوتی ہے آپ کے خطاب کا اکثر و بیشتر عنوان نفس کے وساوس، اعمال کے فساد شہوات کے فتنہ پر ہوتا اور لوگ دلچسپی لیتے اور اپنی اصلاح کرتے ایک موقعہ پر لوگوں نے پوچھا حضور آپ نے یہ علمی جواہر پارے نفس کی اصلاح کے نسخے اور یہ قیمتی ادویات کہاں سے حاصل کیں تو فرمایا میرا یہ سب کچھ حذیفہ بن یمان (رضی اللہ عنہ) کا فیض ہے۔ اس عنوان پر حضرت حسن بصری کا وعظ حیرت انگیز مانا جاتا تھا، صاحب علم وفکر حضرات آپ کے بیان پر حیران و ششدر رہ جاتے تھے نفس کے مکرو فریب سے بچنے کیلئے مولانا بارگاہ رب ذوالجلال میں عرض کرتے ہیں۔

گر ہزاراں دام باشد ہر قدم
چوں تو بامائی نباشد ہیچ غم

اگر نفس کے مکروفریب ایک ایک قدم پر ہزاروں بھی ہوں نفسانی مصائب کا شدید گھیراؤ ہی کیوں نہ ہو مگر تیرا جود تیرا کرم تیرا فضل بندہ کے شامل حال ہو تو کچھ بھی نہیں بگڑ سکتا۔ ایک اور مقام پر اسی عنوان کو اس طرح فرماتے ہیں:

چوں عنایات شود باما مقیم
کے بود بیمے ازاں دزد لئیم

اگر تیری مہربانیاں ہمارے ساتھ ہوں تو کمینے شیطان نفس سے قطعی کوئی خطرہ نہیں

دل بدو دادند ترسایاں تمام
خور چہ باشد قوت تقلید عام

اس شعر میں اُس مکار وفریبی وزیر کی بات کرر ہے ہیں کہ اس کے مکر وفریب سے عام لوگ بہت متأثر ہو گئے اور اس جھوٹے فریبی کو کامل راہنما سمجھنے لگے غرضیکہ عیسائی اس کے دام تذویر میں پھنس گئے اس جعلی راہنما نے انہیں حق سے دور کر دیا۔

در درونِ سینہ مہرش کاشتند
نائب عیساش مے پنداشتند

لوگوں کے سینوں میں اس کی محبت کا ایسا بیج لگ گیا کہ اُسے لوگ عیسیٰ علیہ السلام کا نائب سمجھنے لگے، یہ بات تو واضح ہے کہ عام لوگوں میں مستقل مزاجی کا تو کوئی پہلو ہوتا نہیں محض اپنے خیال پر جس کے ساتھ چاہیں چل جائیں، ان لوگوں نے اس ملعون وزیر کو اپنا رہبر و راہنما بنا لیا۔

صد ہزاراں دام و دانہ ست اے خدا
ما چو مرغان حریص و بے نوا

اس شعر میں حضرت مولانا پریشان ہو کر اللہ سے عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہماری مدد فرما، ہماری حالت تو حریص جانوروں کی ہے اور ہزاروں دام لگے ہوتے ہیں کسی نہ کسی دام میں پھنسنے کا خطرہ ہر وقت موجود ہے۔ مولانا دعا فرماتے ، اے اللہ ہزاروں لاکھوں جال اور دانے پھیلے ہوئے ہیں اور ہم بھوکے اور حریص

پرندے کی طرح گرفتار ہونے کو ہیں۔

یارب قدم قدم پہ ہے غار بلا یہاں
آ تا نظر نہیں مجھے رستہ نجات کا

دنیا کے ہزاروں کے جھنجیڑے رب سے دور کرنے کیلئے قدم قدم پر موجود ہیں ان مشکلات سے نجات صرف اسی کے فضل و کرم سے ہی مل سکتی ہے جس نے بھی دنیا کے کسی ایک مسئلہ سے دل لگا لیا وہ خدا سے غافل ہو گیا، دنیا کے جس ساز و سامان کی وجہ سے خدا سے غفلت ہو گئی وہی شے دنیا کے زمرے میں آ گئی اسی شے نے زندگی کو برباد کر دیا، حقیقت یہی ہے کہ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے اور دنیا کی زندگی محض فریب ہے۔قرآن مقدس نے فرمایا''وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور'' دنیا کی زندگی دھوکہ کے بغیر کچھ نہیں۔

در جہاں مراہ شاں آرام نیست
کایں علف جز لائق انعام نیست

فرماتے ہیں اس سے جہاں میں اہل اللہ کو آرام نہیں اس لئے کہ یہ چارہ چوپائیوں کے لائق ہے۔

جس شخص کی محفل مجلس حسین باغ ہو، وہ بھٹی میں شراب کب پئے گا، اسی باعث اہل اللہ کیلئے یہ دنیا بھٹی ہے اور آخرت تمنائیں، حسین باغ ہیں جس کیلئے موت کے طالب رہتے ہیں، درویش کیلئے یہ باغ و بہار دنیا کا حسن و جمال قید خانہ ہے اور یہ ملک و مال اس کیلئے مصیبت ہے۔قرآن مقدس کا اشارہ بھی اسی طرف ہے''انما

اموالکم و اولادکم فتنہ ''تمہارے مال تمہاری اولاد بڑی آزمائش ہیں''

دمبدم پا بستہ دام نوایم

ہر یکے گرباز و سیمرغ شویم

نفس وشیطان کے مکروفریب سے بچنے کی بات کرتے ہیں اوراپنی کمزوری کا ذکر کرتے ہیں، اے اللہ ہم ہر وقت کسی نہ کسی نئے جال میں پھنس جاتے ہیں ہم باز و سیمرغ ہی کیوں نہ ہوجائیں ہم کتنے ہی کامل کیوں نہ ہوجائیں پھر بھی نفس وشیطان کا جال ہم پر پڑتا رہتا ہے یہ تیری مہربانی ہے کہ تو نجات دیتا رہتا ہے اس نجات کا سبب نور وہدایت ہے اور تعلیم نبوت ہے اور اہل اللہ کی صحبت اور محبت ہے جو ہماری دستگیری کرتی ہے، صوفیاء کی صحبت ومحبت کو حضرت مولانا نے ایک اور مقام پر اس طرح بیان فرمایا ہے۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اہل دل صوفی کامل ولی کی تھوڑی سی صحبت بھی کئی سالوں کی بے ریا عبادت سے قیمتی ہے۔ مولانا کا یہ نظریہ بظاہر مشکل سا دکھائی دیتا ہے کہ کسی ولی کی محفل کے چند منٹ کئی سالوں کی عبادت سے کیسے بہتر ہوجاتے ہیں، مثال سے بات سمجھ آجاتی ہے ناواقف آدمی کی انگوٹھی سے نگینہ گر گیا اب یہ ناواقف بندہ کوشش کرتا ہے کہ وہ پھر انگوٹھی میں جُڑ جائے مگر چونکہ ناواقف ہے زرگر نہیں، دیر ہوگئی کامیاب نہیں ہوا، وہاں سے کسی کاریگر زرگر کا گزر ہوا اور اُسے اس کی پریشانی پر رحم آجائے تو وہ یہی نگینہ ایک لمحہ میں جڑ

دے گا ہوسکتا ہے کوئی ناواقف آدمی اپنے دل میں عشق مصطفیٰ کا نگینہ باوجود محنت کے جڑ نہ سکے اور یہ کاریگر ولی کامل ایک نگاہ کرم سے جڑ دے، اس مثال سے مولانا کے شعر کا مفہوم سمجھا جاسکتا ہے۔

اگر جانور انسانوں سے بہت سی باتیں سیکھ سکتے ہیں تو کوئی کم علم شیخ کامل سے کیوں نہیں سیکھ سکتا۔

میر ہانی ہر دمے مارا و باز
سوئے دامے میر ویم اے بے نیاز

اے پیارے رب قدوس تو ہر لمحہ ہمیں مصائب سے پھندوں سے بچاتا ہے مگر ہم پھر بھی کسی نہ کسی جال کی طرف چلے جاتے ہیں۔اے اللہ تو نے ہماری ہدایت کیلئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا قرآن مقدس کا نزول فرمایا کہ ہم قیامت کے دن عذاب الٰہی سے بچ جائیں، انبیاء علیہم السلام کے بعد اولیاء، اَصفیاء کا وجود بھی ہماری اصلاح کیلئے بنایا مگر ہم پھر بھی گمراہی کے گڑھے میں گرنے اور شیطانی مکروفریب میں پھنسنے سے باز نہیں آتے۔

ما دریں انبان گندم مے کنیم
گندم جمع آمدہ گم مے کنیم

اس شعر میں مولانا انسانی کمزوری اور بے بسی کو ایک مثال سے پیش فرمارہے ہیں کہ ہم اپنی بوری میں گندم بھر لیتے ہیں پھر اچانک وہی بوری خالی ہو جاتی ہے ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا محنت سے کمائی گئی گندم حفاظت سے بوری میں رکھی پھر ختم کیسے ہوگئی۔

مے بیدیشم آخر با بہوش
کایں خلل در گندمست از مکرِ موش

تھوڑے سے غور وفکر کے بعد پتہ چل جاتا ہے کہ گندم کا سارا نقصان چوہے کی شرارت سے ہوا۔

اس مثال سے بتانا چاہتے ہیں ہماری عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ صدقہ وخیرات کا صلہ ان اعمال صالحہ کی برکات نمایاں طور پر دکھائی نہیں دیتیں تو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اعمال صالحہ شیطان کی سازشوں نفس کی مکاریوں سے بے نتیجہ ہو گئے ہیں جیسے چوہے نے بوری کو کاٹ کر گندم برباد کر دی ایسے ہی شیطان نے اعمال صالحہ کو برباد کر دیا۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے حضور ﷺ سے کسی آدمی نے نماز میں ادھر اُدھر دیکھنے کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا یہ جھپٹنا شیطان کا ہے جو بندے کی نماز سے جھپٹ لیتا ہے۔

مُوش تا انبان ما حفرہ زدہ است
واز فنش انبارِ ما ویراں شدہ است

پچھلے شعر میں فرمایا تھا کہ جب ہمیں ذرا عقل و ہوش ہوئی تو ہم سمجھ گئے ہماری بوری سے گندم کس نے خراب کی وہ چوہے کی سازش تھی، اُسی عنوان کو اس شعر میں اس طرح فرماتے ہیں کہ شیطانی وسوسے کے چوہے نے ہمارے دل کے تھیلے میں رخنہ کر کے اپنے مکر وفریب سے ہماری ساری نیکیوں کا ذخیرہ برباد کر دیا۔ بندہ شیطانی وساوس میں پھنس جائے تو اس کے گندے اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان

گندے اخلاق کو دور کرنے کا ایک طریقہ صوفیاء نے یہ بھی بتایا ہے کہ رزق حلال کا استعمال گندے اخلاق کو دور کر دیتا ہے۔ جس کھانے کے بعد علم و حکمت معرفت پیدا ہو جائیں تو سمجھ لو یہ حلال رزق کی برکت ہے، علم و حکمت عشق الٰہی رقت خدا خوفی رزق حلال سے آتے ہیں۔

اول اے جاں دفع شرّ موش کن
وانگہ اندر جمع گندم جوش کن

اس شعر میں مولانا روحانیت کو پروان چڑھانے، دل کی سیاہیوں کو دور کرنے کا نسخہ فرماتے ہیں اگر تو ترقی کی راہوں پر چلنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے شیطانی وسوسوں سے بچنے کا علاج کر، اخلاق و کردار کے بدنما داغوں سے اپنے دل کے شیشہ کو صاف کر پھر تجھے تیری عبادات و ریاضات کے انعامات و برکات کا پتہ چلے گا۔

بشنو از اخبار آں صدر الصدور
لا صلوٰۃ (تمّ) الا بالحضور

اس شعر میں حضرت مولانا اپنے موقف کی تائید میں حضور ﷺ کے ایک ارشاد گرامی کا ذکر فرماتے ہیں کہ نماز کی قبولیت کے درجہ پر پہنچانے کیلئے دل کی حاضری اِخلاص کا جذبہ ہونا بڑا ضروری ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور دل کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں یعنی کمال درجہ نصیب نہیں ہو سکتا ورنہ خیالات کی وجہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی، ہاں صوفیاء کہتے ہیں کہ نماز میں خیالات آئیں تو نماز نہیں ہوتی یہ اہل

اللہ کا مقام ہے ورنہ ہم جیسے گنہگاروں کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے یہ خیالات اُن چوہوں کی طرح ہی ہیں جو گندم کی بوری کو کاٹ کاٹ کر ضائع کر دیتے ہیں۔ اسی عنوان کی تائید میں ایک اور حدیث شریف اس طرح ملتی ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ اپنے نمازی بندے پر برابر متوجہ رہتا ہے جب تک اس کے خیالات اُسے ادھر اُدھر پھیر نہیں لیتے۔

گر نہ موشے دزد در ابنان ماست
گندم اعمال چل سالہ کجا ست

اس شعر میں فرماتے ہیں اگر ہماری گندم کی بوری اعمال صالحہ میں چوہا چور نہیں ہے تو پھر چالیس سال کی محنت عبادت و ریاضت کا اثر کیوں نظر نہیں آتا؟ چالیس سال کا ذکر اس لئے ہے کہ چالیس سال کو بندہ پہنچتا ہے تو اسے احساس پیدا ہوتا ہے کہ اتنی عمر ضائع ہو گئی، عبادات وریاضات برباد ہو گئیں پھر اسے سمجھ آتی ہے کہ شیطان کی مکاریوں نے عبادت کی نعمت سے محروم کیا ہے۔ حدیث پاک میں یہ عنوان اس طرح ملتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا شیطان انسان کی رگ رگ میں خون کی طرح پھرتا ہے۔ اگر نماز میں ریاکاری آ گئی شہرت کا خیال ہو گیا نیک نامی کیلئے نماز پڑھی گئی تو نہایت ضروری ہے کہ ایسے وساوس کو جس قدر جلد ہو سکے ختم کیا جائے کہ ایسے وساوس تو خدا سے دور کرتے ہیں جبکہ نماز خدا کے نزدیک ہونے کا ذریعہ ہے، بعض وساوس ایسے آ جاتے ہیں کہ دل کا خشوع وخضوع ختم ہو جاتا ہے ایسے وساوس بھی نہایت نقصان دہ ہیں جن سے ہر ممکن طریقہ سے بچا جائے، ان تمام قسموں کے

وسوسوں سے بچنے کیلئے وظیفہ استغفار کی کثرت مفید ہے۔

لیک در ظلمت یکے دزدے نہاں
مے نہد انگشت بر استارگاں

عبادت و ریاضت کے بہترین ذخیرہ اور اس کو برباد کرنے والے نفس و شیطان کے چوہے کا ذکر تھا اسی عنوان کو پھر دہرایا جا رہا ہے کہ عبادت و ریاضت کی ساری نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں جب وسوسوں کا چھپا ہوا چور عبادت کے ڈھیر پر انگلی رکھ دیتا ہے جس سے وہ اعمال صالحہ کا سارے کا سارا ذخیرہ بجھ جاتا ہے یہ مثال ایسے ہے رات کی تاریکی میں چور آیا، مالک مکان نے روشنی کرنا چاہی کہ چور کا پتہ چل جائے مگر یہ چور شریر تیز تھا وہ ہر مرتبہ بتی کو گل کر دیتا کہ روشنی میں وہ پکڑا نہ جا سکے۔ مولانا نے اسی مثال کو پیش کر کے فرمایا کہ دل جب عبادت سے روشن ہو جاتا ہے اور اس سے انوار غیب کے شرارے نکلنے لگتے ہیں تو شیطان جو پہلو میں چھپا ہے ان انوار کے شراروں کو بجھا دیتا ہے اور عبادت گزار کے حالات کو روشن نہیں ہونے دیتا۔

چوں عنایاتت شود باما مقیم
کے بود بیمے ازاں دردئیم

اس شعر میں بارگاہِ قدس سے دعا اور التجا کا انداز اختیار کر کے عرض کرتے ہیں اے رب قدوس جب تیری عنایات ہمارے ساتھ ہیں تو پھر ہمیں اس منحوس چور کا کوئی ڈر نہیں اس صورت میں اگر ہر قدم پر ہزاروں دجال بھی پھیلے ہوں تو پرواہ نہیں کہ تیرا فضل شامل حال ہے تیرے کرم کا حصار ہو تو پھر کسی قسم کا خطرہ نہیں کہ اس حصار

کو کوئی دشمن بھی توڑ نہیں سکتا۔اور یہ طاقت ور حصار مضبوط قلعہ نصیب کیسے ہوتا ہے اور اس کی عنایات دستگیری کب کرتی ہیں ۔صوفیاء کہتے ہیں بندے کو یہ بقا اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ فنا میں چلا جائے ،ایک مقام پر مولانا اس صورت حال کو اس طرح فرماتے ہیں

ایں بقاہا از فناہا یافتی
از فنائش او چرا برتافتی

جب حصار خداوندی میں آنے کی بقا تجھے فنا سے ملی ہے تو پھر فنا سے روگردانی کیوں ہو؟ اس شعر میں مولانا نے زور دیا ہے کہ شیطان لعین سے بچنے کیلئے خدائے قدوس کی عنایات ہی طلب کرتے رہو،اسی شعر کی تائید میں دوسرا شعر فرماتے ہیں۔

گر ہزاراں دام باشد ہر قدم
چوں تو بامائی نباشد ہیچ غم

بارگاہ قدس میں عرض کرتے ہیں اے اللہ اگر تیرا ساتھ ہو تیرا فضل دستگیری کرے تو ہزارہا دام بھی بے معنی ہو جاتے ہیں اس شعر میں صوفی سالک اور عارف بندے کو بتایا جا رہا ہے وہ اپنی عبادت وریاضت پر اعتماد بھروسہ نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد بھروسہ کا عمل مضبوط کرتا رہے بڑھتا رہے گا،روحانیت کی کامیابی خود استقبال کرے گی۔

ہر شبے از دام تن ارواح را
مے رہانی مے کنی الواح را

پہلے مضمون کی تائید میں بارگاہ قدس میں عرض کرتے ہیں تو خواب کی حالت میں روحوں کو جسم کی قید سے آزاد کر دیتا ہے، یہ سیرانی روحیں جسم کی قید و بند سے آزاد ہو کر ادھر اُدھر گھوم پھر کر آزاد رہتی ہیں اللہ اسی طرح تو ہمیں بھی باطنی خطرات کے پھندے اور قید و بند کی مصائب سے آزادی دلا دے تو تیرا کیا ہی کرم ہو۔

میر ہند ارواح ہر شب زیں قفس
فارغان بے حاکم و محکوم کس

اس شعر میں بھی پہلے شعر کی کیفیت کو بیان فرمارہے ہیں کہ ہماری روحیں ہر رات جسمانی پنجرے سے چھوٹ جاتی ہیں اور بغیر کسی افسر اور کسی محکوم کے پھرتی ہیں ایسے ہی ہمیں بھی شیطان و نفس کے مکر و فریب کے پنجرے سے آزاد کر دے تو تیرا کرم ہوگا۔

شب ز زنداں بے خبر زندانیاں
شب ز دولت بے خبر سلطانیاں

پہلے شعر کے عنوان کو دوسرے انداز میں پیش کیا جارہا ہے کہ قیدی رات کو خواب میں قید خانہ سے بے خبر ہوتے ہیں، بادشاہ اور کاروباری لوگ رات کو نیند میں اپنے اپنے کاموں سے غافل ہوتے ہیں اس شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ سبھی لوگوں پر غفلت کا عالم طاری ہوتا ہے۔

نے غم و اندیشہ سود و زیاں
نے خیال ایں فلاں و آن فلاں

نہ کسی کو فائدے کا غم ہوتا ہے نہ کسی کو نقصان کا خوف نہ کسی کو اس فلاں اور اس فلاں کا احساس ہوتا ہے، سونے کی حالت میں سیرانی روح نکل جائے قیدیوں کو قید کی خبر دیتی ہے، نہ سلطنت والوں کو دولت کی خبر دیتی ہے، نہ نفع کی فکر نہ نقصان کا اندیشہ نہ زید کا خیال نہ عمر کا۔ نتیجہ یہ کہ جس طرح روحوں کو روزانہ اتنی بڑی قید سے رہائی ملتی ہے، اگر ہم کو بھی باطنی آفات سے بے غم کر دیا جائے تو پیارے اللہ تجھے کیا دشوار ہے۔

حال عارف ایں بود بیخواب ہم
گفت یزداں ہم رقوذ زیں مرم

پچھلے اشعار میں عام لوگوں کے سونے کا ذکر تھا کہ جس طرح روحوں کو بدن سے آزادی بخش کر سبکدوش کر دیا جاتا ہے، اللہ اسی طرح ہمیں بھی باطنی خطرات کے پھندے سے آزادی دلا دے، اس شعر میں اولیاء اللہ کے سونے کا ذکر فرمایا جا رہا ہے عام لوگوں کے سونے کے ذکر کے بعد خاص لوگوں کی نیند کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اللہ والوں کا حال خواب کے بغیر بھی اس طرح ہوتا ہے کہ وہ جسمانی قید سے آزاد ہوتے ہیں، جیسے خدائے قدوس نے اصحاب کہف کے واقعہ میں فرمایا ہے ”تحسبہم ایقاظا وہم رقود“ تو انہیں جاگتے سمجھتا ہے حالانکہ وہ سو رہے ہیں یہ اصحاب کہف اپنے وقت کے ایک بادشاہ دقیانوس کے ظلم سے بچنے کیلئے ایک غار میں پناہ گزیں ہو گئے تھے انہیں اس غار میں ایسی نیند آئی کہ عرصہ گزرنے کے بعد اسی خواب استراحت میں پڑے ہیں ان کی آنکھیں کھلی ہیں اور بظاہر جاگتے محسوس ہوتے ہیں، رب قدوس

نے ان کا ذکر اس طرح فرمایا ہے" وھم رقود " عارف کی حالت کو بیان کیا جارہا ہے کہ وہ جسمانی قید سے آزاد ہوتا ہے بتانا چاہتے ہیں دنیا دار تو ایک معین وقت میں اسباب سے بے خبر ہوتا ہے جسے خواب کہتے ہیں مگر عارف اول ہر وقت دنیا کے تعلقات سے بے خبر رہتا ہے وہ اس استغراق کے ساتھ اپنے رب قدوس سے وابستہ ہوتا ہے گویا وہ ہر وقت دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے سو رہا ہے جیسے کسی نے خوب کہا ہے۔

آزاد نہیں قید میں زنجیر کے ہرگز
ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

مولانا نے عارف اور غیر عارف کے فرق کو واضح کیا ہے جیسے اصحاب کہف بیدار نظر آتے ہیں اور حقیقت میں وہ مصروف خواب ہیں ایسے ہی عارف لوگ بھی بظاہر جاگتے نظر آتے ہیں مگر در حقیقت بے خود ہیں اور جسمانی تعلقات سے آزاد ہیں۔

خُفتہ از احوال دنیا روز و شب
چوں قلم در پنجہ تقلیب رب

عارف کی کیفیت کو مزید بیان فرماتے ہیں کہ عارف دنیا کے حالات سے سویا ہوا ہے اور کاتب کے قلم کی طرح خدا کے دست تحریک سے الٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے، عارف کے حال کو اصحاب کہف کے واقعہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے" ونقلبھم ذات الیمین و ذات الشمال "ہم ان اصحاب کہف کو دائیں بائیں پہلو پر کروٹ دیتے رہتے ہیں، یہ یہی حال عارف کا ہے ہم اس کے اندر بھی ایسے ہی

حالات بدلتے رہتے ہیں۔

اس واقعہ سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عارف کو اپنے پر کوئی عمل دخل نہیں وہ تو قلم کی طرح کاتب کے قبضہ میں ہے جیسے کاتب چاہے قلم کرتا ہے، عارف کے عمل کو یوں سمجھا جائے کہ اس نے اپنے ارادہ کو اپنی رضا کو اس قدر محو کر دیا ہے کہ وہ جو نیک عمل کرتے ہیں گویا ان سے طبعاً صادر ہوتے ہیں جیسے بدر والوں کے متعلق فرمایا گیا ''اعملو ما شئم قد غفرت لکم'' جو چاہو کرو تمہیں معاف کر دیا گیا ہے۔اس کا معنی یہ ہوا کہ ان لوگوں سے نیک عمل کے سوا کوئی اور عمل سرزد ہو ہی نہیں سکتا تھا، ایسے ہی خاصان خدا کا فعل ہر چند امتیاز رہے مگر لازم طبیعت بن جانے کے سبب سے قلم سے تشبیہ دی گئی ہے۔

آنکہ او پنجہ نہ بیند در رقم
فعل پندارد بہ جنبش از قلم

جو بندہ لکھتے وقت ہاتھ کو نہیں دیکھتا وہ اس کام کو قلم کی حرکت سے وجود میں لاتا ہے،

مولانا فرمانا چاہتے ہیں یوں تو سب کچھ اللہ کے قبضہ وقدرت میں ہے مگر ہر شخص کو اس کا احساس نہیں ہوتا، احساس صرف مرد مومن عارف کو ہی ہوتا ہے اس شعر میں فرمایا گیا ہے جو شخص صرف ظاہری سبب کو دیکھتا ہے اُسے یہی محسوس ہوتا ہے کہ قلم لکھ رہا ہے اُسے ہاتھ دکھائی نہیں دیتا جو قلم کو چلا رہا ہے اس بندے کی نظیر حقیقی سبب پر نہیں بلکہ سفلی اسباب پر ہے مولانا فرمانا چاہتے ہیں، تمام قسم کے اسباب افعال اختیاری ہوں یا غیر اختیاری ان تمام اسباب کا حقیقی سبب اللہ تعالیٰ ہے۔

شمۂ زیں حال عارف و انمود
خلق را ہم خواب حسّی در ربود

فرماتے ہیں عارف کے حال کا کچھ نمونہ رب قدوس نے محسوسات کے ذریعہ واضح کیا ہے کہ مخلوق کو بھی خبر وارد ہوتی ہے جو ظاہری ہے اور عارف کو جو نیند وارد ہوتی ہے وہ ''سُکر'' ہے، بے خودی یعنی جیسے سونے والا خواب میں ہوتا ہے اور اُسے اپنا کچھ پتہ نہیں ایسے عارف کی مثال ہے کہ وہ کیف و بے خودی کے عالم میں اپنے آپ سے بے نیاز ہوتا ہے۔

رفتہ در صحرائے بے چوں جانِ شاں
روح شاں آسودہ و ابدان شاں

عارف اور غیر عارف کی کیفیت کو واضح فرمارہے ہیں، حسّی خواب کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک بے مثل عالم کی طرف نکل جاتی ہے، جسم کہیں رہ جاتا ہے مگر عارف کی روح کی مثال یہ نہیں عارف کی اس حالت میں اس کی روح اور اس کا بدن دونوں آرام میں ہوتے ہیں۔

روز آخر چو بازریں سپر
ہندوے شب را بہ بہ تیغ افگندہ سر

خواب کی حالت کا انجام فرماتے ہیں جب ان کا سپاہی یعنی سورج رات کو کاٹ دیتا ہے یعنی دن چڑھ جاتا ہے تو کیفیت یہ ہوتی ہے

میل ہر جانے بسوئے تن بود
ہر تنے از روح آبستن بود

جب دن چڑھ جاتا ہے تو ہر جان کا میلان بدن کی طرف ہوتا ہے اور ہر بدن روح سے وابستہ ہوتا ہے۔

از صفیرے باز دام اندر کشی
جملہ را در دام درد آور کشی

اس شعر میں مولانا بارگاہِ قدس سے عرض کرتے ہیں اے رب قدوس تو پھر شکاری کی طرح لپیٹی دے کر جال بچھا دیتا ہے اور تمام روحوں کو بدن کے تکلیف دہ جال میں ڈال دیتا ہے۔ روح کا تصرف سارے جسم میں بیداری کی صورت میں ہوتا ہے پھر جب نیند آ جاتی ہے تو یہ تصرف ختم ہو جاتا ہے اور جسم بے کار ہو کر آرام کرتا ہے اور جاگنا جسم کیلئے ایک تکلیف دہ جال ہے یا مصیبت ہے کہ اسے جاگنے کی حالت میں روح کی خدمت کرنا پڑتی ہے۔

چونکہ نور صبح دم سر برزند
کرگس زریں گردوں پرزند

جوں ہی صبح کی روشنی پھیلنے لگتی ہے اور سنہری گرہ اُڑنے لگتی ہے یعنی سورج طلوع ہوتا ہے۔

فالق الاصباح اسرافیل وار
جملہ را در صورت آرد زاں دیار

صبح کو پیدا کرنے والا اللہ اسرافیل کی طرح سب کو عالم مثال سے عالم صورت میں لاتا ہے جیسے اسرافیل کے دوبارہ صور پھونکنے سے سب لوگ جو پہلے نیند میں مردہ کی طرح بے حرکت تھے صبح کے آنے پر بیدار ہو جاتے ہیں۔

روح ہائے منبسط را تن کند
ہر تنے را باز آبستن کند

عالم خواب سے بیداری کی کیفیت کو فرمایا جا رہا ہے کہ خواب میں کھلی پھرنے والی روحوں کو بدن میں مقید کر دیتا ہے ہر بدن کو پھر روح بار بردار کر دیتا ہے۔

اسپ جانہارا کند عاری زریں
سرّ النوم اخ الموت است ایں

روحوں کے گھوڑے سے دنیا کے معاملات اتار ڈالتا ہے اور انہیں آزاد کر کے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔

حدیث شریف میں جو آتا ہے کہ نیند موت کی بہن ہے، یہ معناً ہے۔ حضرت جابر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ کیا اہل جنت سوئیں گے تو فرمایا نیند موت کی بہن ہے اور اہل جنت کو موت نہیں آئے گی۔

لیک بہر آنکہ روز آیند باز
بر نہد بر پائے شاں بیند دراز

لیکن جب وہ روحیں رات بھر اپنی حالت میں گزارنے کے بعد ان کو واپس آجائیں تو ان کے پاؤں میں زندگی کی لمبی رسی باندھ رکھتا ہے۔

تا کہ روزش و اکشد زاں مرغزار
وز چراگاہ آردش در زیر باز

فرماتے ہیں یہ رسی اس لئے اس کے پاؤں میں باندھ رکھتا ہے کہ دن میں اس کو اس سبزہ زار (عالم مثال) میں کھینچ لائے اور چراگاہ (خواب) سے اس کو واپس لا کر دوبارہ دنیا کا بوجھ اس پر ڈال دے، حضرت مولانا کے اس شعر کو سمجھنے کیلئے یہ مثال مناسب رہے گی جیسے کسی جانور کو چرنے کیلئے چھوڑ دیا جائے اور اس کے پاؤں میں رسی باندھ دی جائے کہ مالک جب چاہے رسی کھینچ کر اُسے چراگاہ سے واپس بلائے ایسے ہی یہ صورت ہے سونے والے کی روح چراگاہ عالم مثال میں گھومتی رہتی ہے چونکہ قید حیات کی رسی اس کے پاؤں میں پڑی ہے جاگنے کی کوئی بھی کیفیت جب اُسے جھٹکا دیتی ہے تو روح فوراً پہلے ٹھکانے پر آپہنچتی ہے مولانا فرماتے ہیں، اہل اللہ کی مثال بھی ایسی ہی ہے کہ ان کی روحوں کا تعلق بھی دو عالموں سے ہے عالم دنیا سے بھی تعلق ہے اور عالم معرفت سے بھی جس سے وہ مشاہدہ قدرت میں مستغرق ہوتے ہیں۔

کاش چوں اصحاب کہف آں روح را
حفظ کردے یا چو کشتی نوح را

قید حیات کی وجہ سے جو دنیا کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے اس حالت سے بیزاری کا ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کاش اصحاب کہف کی طرح لمبے عرصہ تک دنیا میں نہ آتے یا نوح علیہ السلام کی طرح کچھ وقت کیلئے ہی دنیا کے مصائب سے نجات ملتی۔

تا ازیں طوفان بیداری و ہوش
وار ہیدے ایں ضمیر و چشم و گوش

پہلے شعر میں تمنا ظاہر کی تھی کہ کاش اصحاب کہف کی طرح ہمیں بھی لمبا آرام نصیب ہو یا کم از کم نوح علیہ السلام کی طرح کچھ محدود عرصہ کیلئے ہی نجات ملتی۔ اس شعر میں فرماتے ہیں یہ تمنا اس لئے ہے کہ جاگنے اور باہوش ہونے میں جو ایک احساس ہے وہ غم اندوہ کا سبب ہے اور مصیبتوں کا ایک طوفان ہے اور دنیا کے موارث سے بے خبر رہنا ایک عظیم سکون ہے۔

اے بسا اصحاب کہف اندر جہاں
پہلوئے تو پیش تو ہست ایں جہاں

پچھلے اشعار میں اصحاب کہف کی عظمت کا ذکر تھا اور عام لوگوں کی خواب کا بیان تھا اس میں فرماتے ہیں اے طالب! تو اصحاب کہف کی باتیں کر رہا ہے سن رہا ہے حالانکہ خود تیرے پاس بہت سے اصحاب کہف اس جہاں میں بھی موجود ہیں،

اصحاب کہف کے باطن جیسے اہل اللہ دنیا میں آج بھی موجود ہیں مگر لوگوں کو خبر نہیں۔

غار با تو ویار با تو سر سرود
مہر بر چشمست و بر گوشت چہ سود

فرماتے ہیں تیرے یار دوست تیرے ساتھ گانے بجانے میں مصروف ہیں مگر فائدہ کیا تیرے کان اور آنکھ پر تو غفلت کی مہر لگی ہوئی ہے، اس دنیا میں بہت سے اللہ والے موجود ہیں جو تم میں ملے جلے رہتے ہیں وہ کامل لوگ کمالات کے لحاظ سے اصحاب کہف سے مشابہت رکھتے ہیں مگر ان کی پہچان نہیں کہ دل غافل ہے۔

باز داں کز چیست ایں رو پوش ہا
خم حق بر چشم ہاو گوش ہا

قاری سے فرماتے ہیں اب خود سوچ کہ یہ حجابات اور آنکھوں کا یہ نور کانوں کی یہ کیفیت کس وجہ سے ہے۔ اس راز کو مولانا اگلے اشعار میں مثال دے کر سمجھا رہے ہیں۔

سوال کردن خلیفہ از لیلیٰ وجواب او

خلیفۂ وقت کا لیلیٰ سے سوال کرنا اور اس کا جواب

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی
کز تو مجنوں شد پریشاں و غوئ

خلیفہ وقت نے لیلیٰ سے کہا تو ہی وہ مشہور معشوق ہے جس پر مجنوں پریشان اور دیوانہ تھا۔ خلیفہ وقت نے تعجب و حیرانگی سے لیلیٰ سے سوال کیا تو ہی وہ لیلیٰ ہے جس پر مجنوں مرتا ہے۔ یہ سوال ایسے ہی ہے جیسے سعدی کہتے ہیں یہ پھول جس کا نہ رنگ ہے نہ مہک ہے حیرت ہے بلبل اس پر فریفتہ کیوں ہے۔

از دگر خوباں تو افزوں نیستی

گفت خامش جو نتو مجنوں نیستی

خلیفہ نے کہا لیلیٰ تو دوسرے حسینوں سے کوئی زیادہ حسن و جمال تو نہیں رکھتی ،لیلیٰ نے کہا آپ چپ رہیئے کہ آپ مجنوں نہیں لیلیٰ نے کہا اے بادشاہ وقت میرے حسن و جمال کو دیکھنے کیلئے مجنوں کی آنکھ چاہئے اور وہ آپ میں ہے نہیں۔

دیدۂ مجنوں اگر بودے ترا

ہر دو عالم بے خطر بُودے ترا

لیلیٰ نے کہا جناب خلیفہ اگر آپ کی آنکھ مجنوں کی سی ہوتی تو آپ کے نزدیک میرے مقابلہ میں دونوں جہاں ہیچ ہوتے۔ بادشاہ آپ تو باخود ہیں اپنے عقل وشعور سے ہیں اور مجنوں کی یہ حالت ہے کہ وہ بے خود ہے وہ اپنے میں نہیں، بے ہوش ہے مجنون ہے اُسے تو اپنی خبر ہی نہیں اور عشق کی راہ میں باخبر ہونا عقل و ہوش سے کام لینا معیوب ہے مجنون بے خود ہو کر باہوش ہے اور آپ باخود ہو کر عشق سے دور ہیں۔

لیلیٰ کی یہ مثال دے کر مولانا فرماتے ہیں وہ پردہ جو اللہ والوں کی شناخت سے رکاوٹ بنتا ہے وہ پردہ بیداری اور اپنی ہستی کا احساس ہے جیسے یہ احساس خلیفہ کو

لیلیٰ کے حال کا مشاہدہ کرنے سے رکاوٹ ہے اسی طرح لوگوں کو اہل اللہ کی شناخت سے باز رکھتا ہے، مولانا مثال سے فرماتے ہیں اگر اللہ والوں کے کمال کو دیکھنے کا شوق ہو پھر ضروری ہے کہ اپنی بے خودی کا احساس نہ رکھو۔

ہر کہ بیدارست او در خواب تر
ہست بیدایش از خوابش بتر

فرماتے ہیں جو بندہ دنیاوی کاروبار میں پھنسا رہتا ہے اور بیدار ہے اُسے سمجھو وہ بندہ خدا کی یاد سے غافل ہے اور گہری نیند سو رہا ہے اس کا یہ جاگنا خواب سے بھی برا ہے۔

چوں بحق بیدار نبود جان ما
ہست بیداری چو در بندان ما

فرماتے ہیں جب ہماری جان اللہ تعالیٰ کے لئے بیدار نہ ہو اور اس کی ذات میں محو ہونے سے عاری ہو تو ہمارا یہ جاگنا بیدار رہنا ایک جیل خانہ ہے جس میں قید ہیں دنیا کی بیداری، تعلقات کی مصروفیت یہ ایک قید خانہ ہے اور ہماری دنیوی مصروفیتیں یہ ہمارے پاؤں کی بیڑیاں ہیں اور ہتھکڑیاں ہیں جو ہمیں بارگاہ محبوبیت تک جانے سے رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔

جاں ہمہ روز از لکد کوب خیال
وز زیان و سود و از خوف زوال

نے صفا میماندش نے لطف و فرّ
نے بسوئے آسماں راہ سفر

ان دونوں اشعار میں فرمایا جان کہ سارا دن خیالات کی بھرمار، نفع ونقصان کے تصورات سے پریشان رہتی ہے نہ اس میں صفائی رہتی ہے نہ پاکیزگی کا کوئی انداز ہوتا ہے نہ ہی مصروفیت حق کا موقعہ ملتا ہے نہ ہی آسمان کی طرف راہ سفر ہوتا ہے۔ صبح و شام محض دنیاداری میں گزر جاتے ہیں، بتانا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے مشاغل مصروفیتیں روحانی عروج کیلئے رکاوٹ ہیں۔

خفتہ آں باشد کہ او از ہر خیال
دارد اُمید و کند با اُو مقال

اس سے پہلے اشعار میں ذکر تھا دنیا کی بیداری غفلت ہے اور اللہ کے وہ بندے جن پر یادالٰہی کی سستی طاری ہے وہ بیدار ہیں۔ اسی عنوان کی تاکید اس شعر میں ہے کہ یادالٰہی میں مست لوگوں کو غرق خواب نہ سمجھو، خوابوں میں اُلجھے ہوئے تو وہ لوگ ہیں جو اپنی بیہودہ خواہشات کے نشہ میں مست رہتے ہیں اور یادالٰہی سے غافل ہوتے ہیں۔

نے چنانکہ از خیال آید بحال
آں خیالش گردد او را صد وبال

اس شعر میں مولانا دنیادار، حریص، ہوس پرست اور ایک عارف عاشق کے

تخیّلات کا مقابلہ کر کے حقیقت واضح کرتے ہیں، فرماتے ہیں دنیادار کا خیال عارف کے خیال کا مقابلہ نہیں کر سکتا کہ دنیادار بھی صاحب ذوق عارف کی طرح وجد میں آ جائے اور کسی باذوق مقام تک پہنچ جائے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ اس دنیادار کا خیال تو اس کیلئے بے شمار مصیبتوں کا باعث بن جاتا ہے۔

دیورا چو حور بیند او بخواب
پس ز شہوت ریزد او با دیو آب

پچھلے شعر میں دنیادار حریص کے خیال کو مصیبت فرمایا اُسی کیف کی تشریح اس شعر میں بیان کر دی گئی ہے کہ دنیادار تو خواب میں شیطان کو حور محسوس کر کے اس سے اپنی خواہش پوری کرتا ہے عارف کی یہ صورت حال نہیں۔

چونکہ تخم نسل در شورہ بریخت
او بخویش آمد خیال ازوے گریخت

دنیادار کی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ جونہی دنیادار سونے والا شیطان سے صحبت کر کے فارغ ہوتا ہے تو وہ جاگ جاتا ہے، اور جس سے خواب میں اس نے صحبت کی ہے وہ نظروں سے غائب ہے، عارف ایسے خیالات سے پاک ہوتا ہے۔

ضعف سر بیند ازاں و تن پلید
آہ ازاں نقش پدید نا پدید

اس دنیادار کو خواب میں احتلام ہو جاتا ہے اور جاگتا ہے تو وہ اپنے اندر

کمزوری محسوس کرتا ہے اور اپنے جسم کو پلید پاتا ہے۔

مرغ بر بالا پراں و سایہ اش
میدود بر خاک پراں مرغ وش

دنیادار کی خیالی پرواز کی مثال فرماتے ہیں کہ اس کی مثال تو ایسے ہے جیسے اوپر پرندہ اُڑ رہا ہے اور اس کا سایہ پرندے کی طرح زمین پر اُڑتا جاتا ہے۔

ابلہے صیّاد آں سایہ شود
میدود چنداں کہ بے مایہ شود

پرندے کا سایہ جو زمین پر اُڑتا دکھائی دے رہا ہے کوئی کم عقل شکاری اس سایہ کو شکار کرنے کیلئے دوڑ لگاتا ہے، وہ شکار نہیں کر سکتا اور اپنی بے وقوفی کے باعث تھک جاتا ہے یہی حالت دنیادار کے خواب وخیال کی ہے۔

بے خبر کاں عکس آں مرغ ہوا ست
بے خبر کہ اصل آں سایہ کجاست

وہ بے عقل شکاری کو اس بات کا پتہ نہ چل سکا کہ یہ تو اڑنے والے پرندے کا سایہ ہے اور وہ کم عقل یہ نہیں جانتا کہ اس سایہ کا اصل کہاں ہے؟

تیر اندازد بسوئے سایہ او
ترکشش خالی شود در جستجو

وہ پاگل شکاری سایہ پر ہی تیر مارتا جاتا ہے اور اُسی سایہ کو حقیقی جاندار سمجھ کر

اپنا ترکش خالی کر لیتا ہے اس کے پاس ایک تیر بھی نہیں بچتا۔ مولانا نے خواب کے اندر خیالی تصویر کے ساتھ صحبت کرنے والے کی مثال فرمائی ہے کہ وہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی سایہ کو مرغ سمجھ کر اس پر تیر اندازی کرتا ہے اور اپنے سارے تیر ضائع کر بیٹھتا ہے یہ مثال دنیا کے پریشان کن خیالات کی مذمت ہے۔ کہ وہ اپنے غلط تصورات نظریات کے باعث زندگی برباد کر لیتا ہے، اگلے شعر میں واضح طور پر اس کی ناکامی نقصان اور زندگی کی بربادی کا ذکر کرتے ہیں۔

ترکش عمرش تہی شد عمر رفت

از دویدن در شکارِ سایہ تفت

جانور کے سایہ کو جانور سمجھ کر تیر مارنے والے کے متعلق فرما رہے ہیں اسی طرح اس دنیا دار کی عمر کا تیردان خالی ہو گیا جو یادالٰہی سے غافل رہا اس کی عمر برباد ہو گئی سایہ کو شکار کرنے کی کوشش میں برباد ہو گیا اس شخص نے بے معنی کوششوں میں عمر برباد کر دی۔

سایۂ یزداں چو باشد دایہ اش

وارہاند از خیال سایہ اش

فرماتے ہیں اگر اس عمر برباد کرنے والے فضول شخص کی تربیت کرنے والا کوئی ولی کامل ہو تو اسے بربادی سے بچا لے گا، اس شعر میں نگران محافظ کو دایہ کے لفظ کے تعبیر کیا گیا چونکہ دایہ بچے کی نگرانی اس کی حفاظت میں ماہر و تجربہ کار ہوتی ہے ایسے ہی اس کی اصلاح اور بہتری کیلئے کوئی روحانی شیخ ہی ضامن ہو سکتا ہے۔

سایہ یزداں چو باشد بندۂ خدا
مردۂ ایں عالم و زندہ خدا

خدا کا خاص بندہ مرشد کامل خدا کا سایہ ہوتا ہے جو اس جہان کے تعلقات سے مردہ ہوتا ہے اور رب قدوس کے تعلقات سے زندہ ہوتا ہے، اس شعر میں مولانا دنیا کی فانی اور برباد زندگی کا ذکر کرتے ہیں کہ اس سے بچا جائے اور اس تباہی سے بچانے کیلئے کسی شیخ کامل کی راہنمائی ہی کام دے سکتی ہے۔

دامن او گیر زُوتر بیگماں
تا رہی از آفتِ آخر زماں

تباہ کن اور برباد زندگی سے بچنے کیلئے طریقہ بتا رہے ہیں کہ بہت جلد کسی شیخ کامل کا دامن پکڑ لے تا کہ تو آخر زمانے کی مصیبت سے بچ سکے، آخر زمانے سے مراد زندگی کے آخری لمحات بھی ہو سکتے ہیں کہ تیری موت ایمان پر ہو، آخر زمانے سے مراد قیامت کے قریب دجال کے مکروفریب سے بچنا بھی ہوسکتا ہے۔ آخر زمانے سے مراد قیامت کے دن کی مشکلات بھی ہوسکتی ہیں۔ شعر میں بیگماں لفظ آیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ شیخ کے ساتھ مکمل اعتماد اور کامل اتباع ہو۔

کیف مد الظل نقش اولیاست
کو دلیلِ نور خورشید خدا ست

اس شعر میں حضرت مولانا نے قرآن مقدس کی ایک آیہ مبارکہ کی طرف

اشارہ کیا ہے" الم تر الی ربك كيف مد الظل ولو شاء لجعله ساكنا "اے محبوب کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے کس طرح سایہ کو لمبا کیا اگر چاہے تو اسے ساکن کردے پھر ہم نے آفتاب کو اس پر دلیل بنایا۔ اس مد الظل میں جو سایہ کا اشارہ ہے اس سے مراد اولیاء کرام کا وجود مبارک ہے جو خورشید حق کے نور کی طرف راہنما ہے۔

حضرت مولانا نے اس مثال سے مراد اولیاء اللہ لئے ہیں کہ جس طرح ظاہری سایہ سے سورج اور اس کی رفتار کا پتہ چلتا ہے اسی طرح اولیاء اللہ کی ذات بابرکات سے جو ظل اللہ ہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

اندریں وادی مرو بے ایں دلیل
لا احب الآفلین گو چو خلیل

اس سلوک کی وادی میں بغیر راہبر و رہنما کے نہ چل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح لا احب الافلین کا قائل ہو پھر کامیابی ہوگی، اس شعر میں سالک کو ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تو بھی وہی راستہ اختیار کر وہ راستہ یہ تھا سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے چمکتا ستارا دیکھا جب وہ غروب ہو گیا تو فرمایا میں ایسے فانی ہو جانے والے کو پسند نہیں کرتا، سالک کو بھی چاہئے کہ اس فانی دنیا میں جی نہ لگائے حقیقت پر نگاہ رکھے اور غیر خدا کا گرویدہ نہ بنے۔

رو ز سایہ آفتابے را بیاب
دامن شہ شمس تبریزی بتاب

پچھلے اشعار میں شیخ کامل کی اتباع کا ذکر تھا، اولیاء کو ظل اللہ "اللہ کا سایہ" کہا گیا تھا۔ اس شعر میں بھی اس عنوان کی تائید ہے کہ جاؤ ظل اللہ شیخ کامل کے وسیلہ سے آفتاب حق کو ملو، اب اس شیخ کامل کے ذکر میں مولانا اپنے شیخ حضرت شمس تبریزی کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ شیخ کامل ہیں ان کا دامن پکڑ و اور حق سے ملو۔

مولانا کا نظریہ ہے کہ خدا تک پہنچانے کیلئے اہل اللہ کی دامنگیری بہت ضروری ہے انسانی وجود روح اور جسم دونوں سے وابستہ ہے جیسے جسم کی پرورش کیلئے ہر انسان ہر لمحہ متوجہ رہتا ہے ایسے ہی بہت ضروری ہے کہ روح کی پرورش کیلئے بھی مستعد ہو، روح کو اپنے وطن سے وابستہ رکھنے اور اُسے اس کی خوراک پہچانے کیلئے شیخ کامل سے وابستگی اس کی دامن گیری بہت ضروری ہے، شیخ کی عقیدت و محبت سے درد دل پیدا ہوتا ہے جو فقیروں کی بہت بڑی دولت ہے۔

حضرت مولانا نے اس شعر میں مرشد کی اہمیت واضح کی ہے مرشد کی صحبت سے دلجمعی پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ پیر کے ذریعہ مرید کا رابطہ عالم ملکوت سے ہو جاتا ہے اور رب قدوس کی طرف راستہ کھل جاتا ہے اس راستہ کو کھلا رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ دل میں درد و اضطراب ہو پھر یہ دروازہ ہمیشہ کھلا رہے، درد دل نہ ہوا تو یہ دروازہ بند ہو جانے کا خطرہ ہے اگر شیخ کا وصال ہو گیا ہے تو اسی کا مزار بھی رب قدوس کی طرف توجہ کا وسیلہ بنتا ہے، سالک کے لئے بڑا ضروری ہے کہ اس مقام کو محفوظ رکھنے کیلئے شریعت مطہرہ کی اتباع اور اپنے شیخ کی محبت میں کمی نہ آنے دے۔

رہ ندانی جانب ایں سو و عشق
از ضیاء الحق حسام الدین پرس

فرماتے ہیں اگر تم شمس تبریزی کی صحبت ان کی مجلس ان کی محفل کا راستہ نہیں جانتے ہو تو ضیاء الحق حسام الدین سے پوچھو یہ ممدوح حضرت شمس تبریزی کے خاص صاحب اسرار و راز داں ہیں، فرماتے ہیں اگر شیخ کامل سے آشنائی حاصل کرنا چاہو تو ان کے قریبی راز داروں سے رابطہ کرو، شمس تبریزی کے قریبی راز داں تو خود مولانا ہی ہیں مگر محض کسر نفسی کیلئے اپنا ذکر نہیں کیا اور اپنے خلیفہ ضیاء الحق کا تقرب جتلا دیا، بتانا چاہتے ہیں اللہ رب العزۃ سے ربط بزرگوں کی صحبت اور لگاؤ سے ہی ممکن ہے۔ بارگاہ قدس تک حاضری کیلئے صوفیوں کے دو واسطے ہیں سلوک اور جذب۔ فرق یہ ہے سلوک میں واسطہ ہوتا ہے اور جذب میں فیض براہِ راست ملتا ہے، محبوب حقیقی سے ملنے کیلئے انسانی الائشوں کے وجود کے لباس کو ہٹانا ہوتا ہے۔

ور حسد گیرد ترا در راہ گلو
در حسد ابلیس را باشد غلو

پچھلے اشعار میں مولانا نے اپنے شیخ و مرشد کی عظمت کا ذکر کیا ہے اور فرمایا کہ اگر تو ان تک رسائی حاصل نہ کر سکے تو اُن خدام سے رابطہ کرو وہ رابطہ ضیاء الحق حسام الدین ہیں اس پر کسی کو احساس ہو سکتا تھا کہ مولانا نے ضیاء الحق حسام الدین کو کیوں ترجیح دی ہے ہم ان کا توسل کیوں چاہیں؟، اس شعر میں اُن لوگوں کے غلط خیال کی تردید فرما رہے ہیں۔ فرماتے ہیں اگر حسد تیرا گلا دبائے تو یاد رکھ حسد سب سے پہلے

ابلیس نے کیا تھا، اس کی اتباع سے بچ حسد سے توبہ کر حسد ایک نامراد مرض ہے، جو نیکیوں کو ایسے برباد کر دیتا ہے جیسے آگ لکڑی کو ختم کر دیتی ہے۔ حسد اور طمع ایسی بیماریاں ہیں جو نیکیوں کو برباد کر دیتی ہیں حسد اور طمع کرنے والا اچھائی سے ایسے ہی محروم ہوتا ہے جیسے یہ دونوں لفظ نقطہ سے محروم ہیں۔

کوز آدم ننگ دارد از حسد
با سعادت جنگ دارد از حسد

شیطان حسد کی وجہ سے آدم سے ناراض ہوا اور حسد کی وجہ سے ہی نیکی کی مخالفت کر رہا ہے۔ فرماتے ہیں شیطان نے آدم علیہ السلام کی قدر و منزلت پر حسد کیا اپنے کو بڑا سمجھا کہ وہ آگ سے پیدا ہوا اور آدم علیہ السلام مٹی سے۔ اب بھی وہ بنی آدم سے دشمنی رکھتا ہے یہ شیطانی عمل کسی درویش اہل اللہ و سالک کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ایسا کرے، ضروری ہے حق کی راہ تلاش کرنے میں حسد کینہ سے بری ہو۔

عقبہ زیں صعب تر در راہ نیست
اے خنک آں کش حسد ہمراہ نیست

فرماتے ہیں حسد سے زیادہ مشکل گھاٹی سلوک کی راہ میں کوئی نہیں وہ شخص خوش بخت خوش نصیب ہے جسے حسد کی بیماری نہ ہو اگرچہ سلوک کے راستہ میں اور بھی بے شمار مشکلات و مصائب ہیں اور اس وادی کو طے کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، سلوک کا یہ مرحلہ اُسی کے فضل و کرم سے ہی طے ہوتا ہے، مولانا کا نظریہ ہے کہ حسد سے زیادہ کوئی مشکل نہیں اس سے بچ کر چلو۔

این جسد خانہ حسد آمد بداں
کز حسد آلودہ گردد خانداں

حسد کی مذمت میں فرماتے ہیں ہر جسم حسد کا گھر ہے اور یہ بیماری ایسی خطرناک ہے جس سے سارے کا سارا گھر مبتلا ہو جاتا ہے۔ حسد انسان کے اندر کا مرض ہے، یہ مرض جب دل میں پیدا ہو جاتا ہے تو پھر سارے اعضاء دل و دماغ عقل وفکر اسکی گرفت میں آجاتے ہیں اور یہ ساری قوتیں حسد کے تابع ہو کر کام کرنے لگ جاتی ہیں جو پرلے درجہ کی گمراہی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ذہن میں رہے، فرماتے ہیں حسد سے بچو حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے۔

خانمانہا از حسد گردد در خراب
باز شاہی از حسد گردد غراب

فرماتے ہیں حسد سے گھر بار برباد ہو جاتے ہیں بادشاہ کا باز حسد کی نحوست سے کوّا بن جاتا ہے جب حسد پیدا ہو جاتا ہے تو انسان کا باطن برباد ہو جاتا ہے باطن کا حسن اخلاص اور اخلاق ہے اچھے کام ایک نجاست کھانے والے کوے کی مانند ہو گئے۔

گر جسد خانہ حسد باشد و لیک
آن جسد را پاک کرد اللہ نیک

جسم حسد کا گھر ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس جسم کو شیخ کامل کی وساطت سے پاک کر دیا ہے۔

اس شعر میں حسد کا علاج فرما رہے ہیں اگر حسد والی مصیبت تیرے گلے پڑ گئی ہے تو اس سے نجات حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ کسی شیخ کامل کا دامن گیر ہو جا بچ جائے گا۔

یافت پاکی از جناب کبریا
جسم پر از کبر و پر حقد و ریا

اللہ کے فضل و کرم سے جسم نے پاکیزگی حاصل کر لی جو پہلے تکبر و غرور اکڑ بازی اور دشمنی سے پر تھا۔

اس شعر میں فرماتے ہیں مشکلات و مصائب گناہوں کی آلودگی برے اخلاق شیطانی عادات سے بچنے کا یہی طریقہ ہے اہل اللہ کے ساتھ اپنا تعلق جوڑ لیا جائے اور ریاضت و مجاہدہ سے ان بیماریوں کا قلع قمع کر دیا جائے۔

طہرا بیتی بیان پاکی ست
گنج نور ست از طلسمش خاکی ست

اس شعر میں حضرت مولانا اللہ رب العزۃ کے ایک حکم کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں، جو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو دیا گیا تھا کہ تم دونوں میرے گھر کعبہ کو طواف کرنے والوں، رکوع و سجود کرنے والوں کیلئے پاک صاف کرو یہ مثال بیان کر کے فرماتے ہیں، مومن کا دل بھی اللہ کا گھر ہے اُسے روحانی بیماریوں سے پاک صاف کیا جائے تا کہ اس میں قدرت کے جلوے نمایاں ہوں، فرماتے ہیں یہ گھر جس کی پاکی کا حکم دیا جا رہا ہے، نور کا خزانہ ہے اگر چہ اس کا طلسم خاک سے بنایا گیا

ہے۔تعمیر کعبہ کی مثال دے کر فرماتے ہیں کہ تیرے دل پر بھی قدرت کی طرف سے انوار و برکات نازل ہوتے ہیں تو بھی اپنے دل کو پاک صاف رکھ کہ رحمات و برکات کا نزول ہوتا ہے اس شعر میں مولانا نے اپنے دل کی صفائی پر استدلال کیا ہے اور اس پر آیہ مبارکہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چوں کنی با بے حسد مکر و حسد

زاں حسد دل را سیا ہیہا رسد

سالک سے فرماتے ہیں اگر تو کسی بے حسد بزرگ سے حسد کرے گا، تو تیرا یہ عمل اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، البتہ تیرے دل پر ہی سیاہی چھا جائے گی، پچھلے کئی اشعار میں حسد کی مذمت اور برائی بیان فرما رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے روحانی دولت کو برباد کرنے میں حسد کا بڑا حصہ ہے ان تمام اشعار میں حسد سے پرہیز کا درس ملتا ہے، اس بیماری کا ایک علاج یہ ہے اللہ رب العزۃ کی قدرت پر یقین کامل ہو کہ جس سے حسد کیا جا رہا ہے اُسے وہ کمالات رب العزۃ نے دیئے جنہیں حسد سے چھینا نہیں جا سکتا ہے۔

خاک شو مردان حق را زیر پا

خاک بر سر کن حسد را ہمچو ما

اس شعر میں اس بیماری کا علاج فرماتے ہیں اگر تجھے یہ بیماری لگ گئی ہے تو اس سے نجات کیلئے اہل اللہ کے قدموں کی خاک ہو جا اور ہماری طرح حسد پر مٹی ڈال دے۔

در بیان حسد کردن وزیر جہود

یہودی وزیر کے حسد کا بیان

(نوٹ) اس سے چند صفحات پہلے یہودی وزیر کے حسد کا ذکر ہوا ہے اب پھر اسی وزیر کے حسد کو بیان کر رہے ہیں۔

آں وزیرک از حسد بودش نژاد
تا بباطل گوش و بینی باد داد

وہ کمینہ وزیر حسد سے بنا تھا جبھی اس نے ناحق اپنے کان اور ناک برباد کر لئے۔

بر اُمید آنکہ از نیشِ حسد
زہر او در جان مسکیناں رسد

اس وزیر نے اس اُمید پر کان ناک کٹوا لئے کہ حسد کے ڈنگ سے اس کا زہر بے چارے عیسائی لوگوں کی جان میں سرایت کر جائے۔

ہر کسے کو از حسد بینی کند
خویش را بے گوش و بے بینی کند

جو شخص حسد میں آ کر حق و انصاف سے انکار کرے وہ اپنے آپ کو حق سننے والے کان اور حق محسوس کرنے والی ناک سے محروم کر لیتا ہے جیسے قرآن مقدس میں ارشاد ہے "ولھم اذان لا یسمعون بھا" ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں

یعنی حق بات نہیں سنتے یا سنتے تو ہیں مگر پرواہ نہیں کرتے ، اِدھر اُدھر اُڑا دیتے ہیں۔

بینی آن باشد کہ او بوئے برد
بوئے او را جانب کوئے برد

حق کو محسوس کرنے والی ناک وہ ہوتی ہے جو حق کی بو حاصل کرے اور یہ بو اُسے کسی کوچہ کی طرف لی جائے۔

پہلے شعر میں تھا کہ احساس نہ کرنے والے لوگوں کے کیا ناک کان ہیں، جن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، فرماتے ہیں ہم تو اس ناک کو قائم سمجھتے ہیں جو حق کی بو محسوس کرے اور یہ احساس اس کیلئے اللہ تک پہنچنے کا سبب بنے۔

ہر کہ بویش نیست بے بینی بود
بوئے آں بوئیت کاں دینی بود

جس شخص کے پاس بو سونگھنے کی ہمت طاقت نہیں وہ بے ناک ہوتا ہے اس بو سے مراد دینی بُو ہے، جو شخص بو سونگھنے کا آلہ نہیں رکھتا وہ گویا بے ناک ہے۔

چونکہ بوئے برد و شکر آں نہ کرد
کفر نعمت آمد بینیش خورد

جب کسی اہل اللہ عارف باللہ کا علم ہو جائے پھر اس کی قدر نہ کرے تو وہ بندہ احسان خداوندی کو فراموش کرتا ہے جو اس کی قوت شناخت کو ختم کر دے گا فرماتے ہیں جب کسی مرد خدا کا علم ہو جائے تو اس کی قدر کرنی چاہئے جب اللہ کسی دولت سے

نوازے پھر وہ انکار کرے تو خدا کی نعمت کا منکر ہے اُسے ایسی ناشکری سے بچنا چاہئے۔
قرآن مقدس فرماتا ہے''واشکروالی ولا تکفرون   ''میرا شکر کرو اور کفر نہ کرو۔
یہی عنوان دوسری جگہ اس طرح ملتا ہے''وسنجزی الشاکرین ''ہم شکر کرنے والوں کو اجر دیں گے ۔شکر کرنے پر نعمت کا اضافہ ہوتا ہے جیسے ارشاد خداوندی ہے''لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید ''شکر کرنے پر اللہ تعالیٰ نے مزید عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے ۔شکر گزار بندے کی عظمت ایک حدیث شریف سے اس طرح ملتی ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں کھانے والا شکر گزار اس روزے دار کی طرح ہے جو صبر کرنے والا ہے۔اس ضمن میں حضرت عطاء علیہ الرحمہ سے ایک روایت اس طرح ملتی ہے،آپ سیدہ عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی اماں جی !حضور ﷺ کی کوئی عجیب بات فرمائیں،آپ رو پڑیں اور فرمایا بیٹے ان کا کون سا حال ہے جو عجیب نہیں تھا،فرماتی ہیں آپ ایک رات اُٹھے وضو کیا نماز میں کھڑے ہو گئے آپ اس قدر روئے کہ آنسو مبارک سینہ پاک پر گرتے رہے قیام رکوع سجدہ میں آہ وزاری رہی میں نے عرض کی یارسول اللہ آپ تو نبی ہیں معصوم ہیں اس قدر کیوں روئے ،فرمایا عائشہ کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

شکر کن مر شاکراں را بندہ باش
پیش ایشاں مردہ شو پائندہ باش

فرماتے ہیں اے سالک شکر کر اور شکر گزار اہل اللہ کا غلام بن جا اور ان کی خدمت میں کبر و غرور کو ختم کر کے اور ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لے،اہل اللہ کے سامنے

اپنی خودی کو مٹا دینا ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہے اگر کسی باکمال کے سامنے سرِ خم کرنا اس کی اطاعت کرنا خودی کو مٹانا نہیں تو روحانیت کی منزل مقصود پر پہنچنا مشکل ہے۔

چوں وزیر از رہزنی مایہ مساز
خلق را تو برمیا در از نماز

وزیر کی طرح ڈاکو بننے کا انداز اختیار نہ کر اور مخلوق کو نماز سے نہ روک۔

فرماتے ہیں عارف کو پہچاننے اس کی خدمت بجالانے کی بجائے خود جھوٹے شیخ بن بیٹھنا اور وزیر کی طرح لوگوں کو راہ حق سے روکنے کیلیئے ڈاکو نہ بن جانا۔

ناصح دیں گشتہ آں کافر وزیر
کردہ او از مکر در موزینہ سیر

وہ بے دین وزیر مذہبی راہنما بن گیا اور اس نے اپنے مکروفریب سے حق و باطل کو خلط ملط کر دیا۔

ہر کہ صاحب ذوق بود از گفت او
لذتے میدید و تلخی جفت او

باذوق بندہ اس کی عیارانہ گفتگو سے عارضی طور پر لطف اُٹھاتا اور پھر آخر کار اس کی گمراہی بھی محسوس کر لیتا کہ مکر آخر مکر ہے فریب آخر فریب ہے جھوٹ چھپ نہیں سکتا، اس وزیر کو دنیا کے مکروفریب نے رسوا کر دیا تھا۔ قرآن مقدس فرماتا ہے ''فلا تغرنکم الحیٰوۃ الدنیا''، تمہیں دنیا کی زندگی فریب میں نہ ڈال دے، یہ وزیر خدا

خوفی سے عاری ہو گیا تھا کاش اسے یہ پتہ ہوتا کہ تقویٰ اور یقین تو ساری زمین کے فریب زدوں سے بہتر ہے۔

نکتہ ہا میگفت او آمیختہ

در جلاب و قند زہرے ریختہ

اس مکار اور فریبی وزیر کی مکاری کو بیان کرتے ہیں کہ وہ ادھر اُدھر کی باتیں ملا ملا کر شربت و چینی میں زہر گھول گھول کر نکتے بیان کرتا تھا جو لوگوں کے دین و ایمان کی بربادی کا سبب بنتے تھے اور اس کی گندی گفتگو سے لوگوں پر روحانی موت طاری ہوتی تھی کہ لوگ اس مکارانہ گفتگو سے حق سے دور ہو جاتے تھے۔

ہاں مشومغرور زان گفت نکو

زانکہ دارد صد بدی در زہر او

اس شعر میں مولانا سالک سے ہدایت فرماتے ہیں خبردار اگر تجھے بھی کسی ایسے مکار فریبی سے واسطہ پڑ جائے تو اس کی ظاہری پسندیدہ گفتگو سے دھوکا نہ کھا جانا اس کی گفتگو بے شمار خرابیاں رکھتی ہے، مکاروں سے ہوشیار رہنے کا درس دیا جا رہا ہے۔

او چو باشد زشت گفتش زشت داں

ہر چہ گوید مردہ آں را نیست جاں

جب وہ بندہ خود برا ہے تو اس کے اعمال بھی برے ہی ہوں گے وہ بندہ خود مردہ دل ہے جو کچھ کہے گا اس میں جان نہیں ہو گی کہ اس بندے نے حق و باطل کو ملا دیا

ہے جو سراسر گمراہی ہے ایسے لوگوں کے کام طمع اور لالچ کے تحت ہوتے ہیں ان کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہوتا۔

گفت انساں پارۂ انساں بود
پارہ از ناں یقین کہ ناں بود

آدمی کی گفتگو سے اس کی کیفیات کا پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی گفتگو میں ہے کیا، کیا چاہتا ہے اور کرنا کیا چاہتا ہے روٹی کا ٹکڑا بھی تو آخر روٹی ہی ہے۔

زاں علی فرمود نقل جاہلاں
بر مزابل ہمچو سبزہ ست اے فلاں

اس شعر میں مولانا حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کے ایک قول کا حوالہ دے کر صورت حال بیاں کرتے ہیں، آپ نے فرمایا جاہل کی نصیحتیں ایسے ہی ہیں جیسے گندگی کے ڈھیر پر سبزہ ہو۔ اس حوالہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جاہل کا ظاہری حال و مقال بھی بے معنی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں کہ جاہل کا باطن نور معرفت سے خالی ہے۔

بر چناں سبزہ ہر آنکو بر نشست
ہر نجاست بیش کے بنشستہ است

جو شخص ایسے سبزہ پر بیٹھا جو گندگی پر ہے تو وہ یقیناً گندگی پر ہی بیٹھا ہے، اس شعر میں مولانا جاہلوں مکاروں فریبیوں سے کنارہ کشی کا درس دے رہے ہیں کہ ان میں بیٹھ کر اپنی عاقبت کو خراب نہ کیا جائے۔

بایدش خود را بشستن از حدث
تا نماز فرض او نبود عبث

پچھلے شعر میں فرمایا تھا کہ اگر گندگی کے ڈھیر پر سبزہ دیکھے اور وہ سبزہ بھی نجس ہو تو ظاہر ہے اس کے کپڑے خراب ہوں گے جسم پلید ہوگا۔اب فرماتے ہیں کہ سالک کو چاہئے نجاست سے بچے،جسم کو پاک صاف رکھے کہ نماز کی ادائیگی کرے تو نماز جائز درست ہو جیسے ظاہری جسم اور کپڑے کو نجاست سے بچانا ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ دل کو برے خیالات غلط نظریات سے محفوظ کرنا ضروری ہے کفر شرک اور نفاق سے پاک ہو،روحانیت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کیلئے قلب سلیم کا ہونا بڑا ہی ضروری ہے،قرآن مقدس فرماتا ہے قیامت کے دن جب کسی قسم کا مال اولاد کام نہیں آئیں گے اس دن قلب سلیم بچائے گا،تصوف کا پہلا قدم قلب کی مدد سے ہی اُٹھتا ہے،زندہ دل آدمی نئے زمانے اور نئے عہد پیدا کرتا ہے۔

ظاہرش میگفت در رہ چست شو
و از اثر میگفت جاں را مشت شو

اس شعر میں اُس حاسد اور مکار وزیر کا ذکر فرماتے ہیں اس وزیر کا ظاہر تو کہتا تھا کہ راہ معرفت میں چست ہو اور اثر کے لحاظ سے جان کو برباد کرتا تھا اسے نفاق کہتے ہیں اور یہ دل کو برباد کرنے والا مرض ہے یہ مرض ایمان اور یقین دونوں کو خراب کر دیتا ہے۔

آتش ارچہ سرخروئے ست از شرر
تو ز فعل او سیہ کاری نگر

فرماتے ہیں آگ اگرچہ سرخ ہے اس کے انگارے چمک رکھتے ہیں مگر اس کا کام نتیجہ کے طور پر سیاہ ہے کہ تمام اشیاء کو خاکستر بنا دیتی ہے، یہی حال منافق واعظ کا ہے اس کا لچھے دار انداز دل کو بھاتا ہے مگر اس مکار حاسد کے کلام کا اثر تباہ کن ہے۔

برق اگرچہ نور آید در نظر
لیک ہست از خاصیت دزد بصر

دوسری مثال فرماتے ہیں بجلی اگرچہ نور دکھائی دیتی ہے مگر اپنی خاصیت کے لحاظ سے بینائی کو خراب کر دیتی ہے، یہی حال حاسد مکار کا ہے بظاہر گفتگو سے اچھا معلوم ہوتا ہے مگر آخرکار بربادی کا سبب بنتا ہے۔

ہر کہ جز آگاہ و صاحب ذوق بود
گفت او در گردن او طوق بود

پچھلے اشعار میں اس مکار وزیر کے ظاہر و باطن کا کہا گیا اس شعر میں پھر پہلے واقعہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں پہلے تو وزیر سے متنفر اہل علم عیسائی ہوئے تھے کہ انہوں نے اس کے مکر و فریب کو محسوس کر لیا اب عوام کی حالت بیان کرتے ہیں کہ عوام اس کے مکر و فریب میں گرفتار ہو گئے اس کی باتیں عام لوگوں کیلئے مصیبت بن گئیں۔

مدت شش سال در ہجران شاہ
شد وزیر اتباع عیسیٰ را پناہ

چھ سال تک وزیر بادشاہ سے الگ رہ کر مسیحیوں کیلئے دینی دنیوی پناہ بنا رہا۔

دین و دل را کل بدد بسپرد خلق
پیش امر و نہی اوو مے مرد خلق

اس مکار وزیر کا یہ عالم رہا کہ عوام نے اپنا ایمان سب کچھ اس کے سپرد کر دیا اور اس کے ہر حکم پر جان دیتے رہے، بادشاہ اور وزیر کے درمیان خط و کتابت نامہ پیغام کا سلسلہ جاری تھا، وزیر کے پیغامات سے بادشاہ کو تسلیاں ملتی رہیں آخر کار بادشاہ نے وزیر کو پیغام دیا کہ عیسائیوں کے مشن کو جلد برباد کر، میں پریشان ہوں مجھے اس غم سے جلد نجات دے۔

گفت اینک اندر آں کارم شہا
افگنم در دین عیسیٰ فتنہا

مکار وزیر نے بادشاہ کو جواب میں لکھا جناب میں ابھی کام میں مصروف ہوں کہ عیسیٰ کے دین میں فتنے برپا کروں میں جب فتنے پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو دین عیسیٰ کی بربادی بھی یقینی ہو جائے گی۔

قوم عیسیٰ را بد اندر دارد گیر
حاکماں شاں دہ امیر و دو امیر

فرماتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے نظم وضبط قائم رکھنے کیلئے بارہ حاکم مقرر تھے اور قوم کے بارہ گروہ تھے۔ایک گروہ پر ایک حاکم مقرر تھا یہ بارہ کے بارہ امیر اور سارے کے سارے بارہ گروہ اس مکار وحاسد وزیر کے تابع فرمان ہو گئے اور سبھی کے سبھی اس کا حکم ماننے لگے۔

چوں زبوں کرد آں جھودک جملہ را
فتنہ انگیخت از مکرو رہا

جب اس کمینے یہودی مکار وزیر نے سب کو تابع فرمان بنالیا تو فریب اور چالاکی سے ایک فتنہ برپا کر دیا، اس مکار یہودی نے ہر گروہ کے سردار کو الگ الگ احکام جاری کیئے، سارے احکام ایک دوسرے کے خلاف تھے، وزیر کا مقصد تھا کہ لوگوں میں فتنہ وفساد اُبھر جائے اس نے اس فاسد ارادہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے مذہبی میدان کا انتخاب کیا۔فتنہ وفساد کا یہ طریقہ آج بھی رائج ہے جب کوئی حکمران اپنی رعایا پر غلبہ چاہتا ہے اور قوم کو اپنی قید میں رکھنا چاہتا ہے تو مذہبی معاملات میں اختلاف ڈلوا دیتا ہے کہ اس کا نظام حکومت چلتا رہے اس یہودی وزیر نے عیسائیوں کے بارہ جماعتوں میں ڈال کر فتنہ برپا کر دیا۔یہود کا انداز دشمنی صرف نصاریٰ سے ہی نہیں یہ لوگ اسلام اور بانی اسلام کے بھی شدید دشمن ہیں۔

مدینہ منورہ میں جو معاہدہ امن کیا گیا اُسے یہود نے ہی توڑا تھا، اسلام دشمنی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جنگ بدر میں یہود نے شدید سازش کی اور مشرکین کا بھر پور ساتھ دیا، جنگ بدر کی شکست کا بدلہ لینے کیلئے یہود نے ہی جنگ اُحد کیلئے حالات

پیدا کئے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی یہود کے ہاتھوں ہوئی، عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت میں یہود کی سازش شامل تھی، عبداللہ بن سبا کے نام سے اسلامی لباس میں کام کرنے والے شخص نے ہجرت کی پہلی صدی میں اسلام میں سخت تفرقہ پیدا کیا، اس نے سینکڑوں موضوع احادیث کا دفتر تیار کیا اور مسلمانوں میں فتنہ ڈالا اور اپنا معتقد بنایا اور دوسرے مسلمانوں کے دلوں میں مخالفت دشمنی کا بیج بویا یہ اثنا عشری گروہ ہے جو اس سے متاثر ہوا۔

حضور ﷺ کو کھانے میں زہر ملا کر دینے والی خاتون یہودی ہی تھی، یہ اللہ کا کرم تھا کہ کھانے نے بول کر کہا حضور! مجھ میں زہر ہے تناول نہ فرمائیں۔ صلیبی جنگوں کی ذلت آمیز شکست کا بدلہ لینے کیلئے عیسائیت کسی محسن کی تلاش میں تھی جو اُسے یہودیت کے رنگ میں مل گیا۔ کمیونزم اور سوشلزم کی تحریکیں جو یہود نے ترتیب دیں یہ اسلام دشمنی ہی تھی، جرمن یہودی کارل مارکس اس دشمنی میں پیش پیش تھا۔ کارل مارکس کی تقاریر اور نصیحتیں اکثر ان نظریات کی ترجمان تھیں۔ وہ کہتا تھا سرمایہ دارانہ نظام سے جان بچانے کیلئے تین باتوں پر عمل ضروری ہے

۱۔ خدا کو چھوڑ دیا جائے

۲۔ مرنے کے بعد جی اُٹھنے کا تصور ختم ہو

۳۔ دین کو بے معنی سمجھا جائے

۴۔ مذہب کو افیون قرار دیا جائے۔

یہود کی اسلام دشمنی کا ایک واضح پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے عرب کے وسیع ترین خطہ کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہونے کے حالات پیدا کر دئے اور اس

دشمنی میں وہ کامیاب رہے، پاکستان کی اتحادی قوت کو پارہ پارہ کرنے کیلئے یہود نے اسے دوحصوں میں تقسیم کرادیا۔ مسلمانوں کی ایک تنظیم اخوان المسلمون کوایک گھناؤنی سازش کے تحت مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان کو پابند سلاسل کیا، پچاس ہزار سے زائد مسلمانوں کو جیلوں میں ڈلوایا اور سرکردہ لوگوں کو تختہ دار پر لٹکا کر عالم عرب کی سیاسی قوت کو کچل کر صیہونیت کی راہ ہموار کردی گئی۔ یہودیوں نے فری میسن تنظیم کو فروغ دے کر مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کی کوشش کی، اس تنظیم کے ذریعہ سے بڑے بڑے لوگوں کو خرید کر اسلام سے دور کیا شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی سرفہرست ہیں۔ یہ اس تنظیم کے ۲۲ ویں گریڈ کے رکن تھے، پاکستان کے اندر یہودیت کو فروغ دینے کیلئے اس تنظیم کو عام کیا گیا۔

ہندوستان میں خلاف اسلام سازشوں میں یہودیت نے کھل کر کام کیا ہے، مہاشہ راجپال جسے علم الدین شہید نے قتل کیا، یہ یہودیوں کا آلہ کار تھا، نتھو رام جسے محمد صدیق شہید نے قتل کیا یہ بھی یہود کا آلہ کار تھا ۱۹۳۵ء میں مدراس چھاؤنی کے ایک بدبخت چرن داس جسے غازی محمد شہید نے قتل کیا یہ بھی یہود کا آلہ کار تھا۔

حضرت مولانا روم علیہ الرحمہ نے اس شعر میں حاسد مکار یہودی کا ذکر کر کے ملت اسلامیہ کو یہود و نصاریٰ سے محتاط رہنے کا درس دیا ہے، ۲۰۱۵ء میں فرانس کے اندر لاکھوں کی تعداد میں گستاخانہ خاکے چھاپ کر اسلام اور بانی اسلام کی توہین کی گئی یہ یہود کی ہی سازش تھی، پھر اس سازش کی حمایت میں یورپین دشمنوں کا دس لاکھ افراد پر مشتمل جلوس نکالنا یہودی سازش تھی جس میں عیسائی بھی شریک ہو گئے حالانکہ عیسائی یہودیوں کو اپنا دشمن جانتے ہیں کہ ان کے عقیدہ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو سولی

چڑھانے والا بادشاہ یہودی تھا مگر عیسائی کئی جنگوں میں مسلمانوں سے شکست کھا چکے تھے غالباً یہ اتفاق اس لئے کیا کہ اکٹھے اسلام دشمنی میں کام کریں۔

حاسد اور مکار وزیر کے کسی حکم میں ریاضت وعبادات کا کوئی طریقہ تھا کسی میں کوئی۔ کسی حکم میں ریاضت اور روزے کے طریقے کو توبہ کا رکن کہا کسی حکم میں کہا ریاضت مفید نہیں، راہ حق پانے کیلئے صرف خیرات وصدقات ہی کافی ہیں۔

در یکے راہ ریاضت را وجوع

رکن توبہ کردہ و شرط رجوع

اس مکار وزیر کے مختلف حکموں کو بیان کیا جا رہا ہے کسی حکم میں تھا کہ ریاضت کے طریقے اور روزہ کو توبہ کا رکن اور اللہ کی طرف مائل ہونا شرط قرار دیا۔ مولانا نے اس کے اس حکم سے اس لئے اختلاف کیا ہے، عبادات و ریاضات اصلاح نفس کا اچھا ذریعہ ضرور ہیں مگر ایسا انداز اختیار نہ کیا جائے جس سے رب قدوس کے انعامات کی بے قدری ہو۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کی حضور مسلسل روزہ رکھنا کیسا ہے تو فرمایا'' لا صام ولا افطر '' حضور ﷺ نے اپنا عمل مقدس فرمایا میں روزہ رکھتا ہوں چھوڑتا بھی ہوں۔ مسلسل بلا افطار روزہ رکھنے میں سنت مصطفےٰ کا عمل ترک ہوتا ہے حضور ﷺ نے روزہ وصال مسلسل روزہ رکھنے سے منع فرمایا، ایک شخص نے عرض کی حضور آپ تو روزہ ہمیشہ رکھتے ہیں تو فرمایا'' ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی ربی و یسقینی او کما قال ﷺ ''(مشکوٰۃ شریف)

تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ میں تو اپنے رب کے پاس رات گزارتا ہوں وہ

مجھے کھلاتا ہے، حضور ﷺ نے ایک روزے کو دوسرے روزے کے ساتھ بلا انکار ملانے سے منع فرمایا ہے اسی کے متعلق فرمایا جس نے ایسا کیا کہ مسلسل بلا افطار روزہ رکھا نہ اس کا روزہ ہے نہ افطار ہے۔

در یکے گفتہ ریاضت سود نیست
اندریں رہ مخلصی جز جود نیست

مکار وزیر نے اپنے ایک اور حکم میں یہ کہا کہ ریاضت سے کچھ فائدہ نہیں، حق کی راہ میں تو صرف صدقات وخیرات سے نجات ملتی ہے، اس کا یہ حکم بھی قطعی غلط بے معنی تھا کہ ریاضت کو بے فائدہ قرار دیا حالانکہ ریاضت اصلاح نفس کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔اس کا خیرات کرنے کے عمل کو ہی مرکز قرار دینا صحیح نہیں کہ جودوکرم میں بھی درجہ اعتدال ہی مفید ہے کہ رب قدوس فضول خرچی کو پسند نہیں فرماتا اور فضول خرچوں کو شیطان کے بھائی قرار دیتا ہے ۔ وزیر کا یہ حکم پہلے کے قطعی برخلاف ہے یہاں ریاضت کو بے سود قرار دیا اور خرچ کرنے کو نجات کہا وہ خرچ جہاں بھی ہو حالانکہ ہر نیک وبد کے ساتھ حسن سلوک عموماً اچھا نہیں۔شیخ سعدی فرماتے ہیں

نکوئی بابداں کردن چناں است　　　که بدکردن بجائے نیک مرداں

شیخ سعدی فرماتے ہیں بروں کے ساتھ اچھا سلوک ایسے ہی ہے جیسے نیکوں کے ساتھ برا کرنا ہے،وزیر کے خرچ کرنے پر تنقید کی جارہی ہے۔

جز توکل جز کہ تسلیم تمام
در غم و راحت ہمہ مکرست و دام

توکل کے بغیراورغم وراحت میں کمال تسلیم کے بغیر تمام ریاضات وخیرات بے معنی ہیں اور مکر وفریب ہے۔اس مکار وزیر کا ایک حکم یہ تھا کہ توکل کے بغیر ریاضات وخیرات کا کچھ فائدہ نہیں یہ حکم بھی محض دھوکہ تھا یہ درست ہے اللہ پر توکل بھروسہ اسباب پر نگاہ رکھنے کے بجائے مسبب الاسباب ذات قدس جل مجدہٗ پر بھروسہ بہت بڑی شی ہے مگراس عظیم مقام پر توکل علی اللہ پر پہنچنے کیلئے یہ کہاں ضروری ہے کہ اس کے بغیر ریاضات وعبادات کا کوئی معنی نہیں ، یہ فیصلہ اس کی مکاری تھی جہالت تھی حقیقت یہ ہے کہ توکل اور طاعات دونوں ضروری ہیں، بندہ کی طرف سے ضروری ہے کہ کوشش کرے اوراس کی کامیابی کیلئے اللہ پر توکل وبھروسہ ہو۔"السعی منی والاتمام من اللہ" کا اصول ہمیشہ پیش نظر رہے،کوشش میری طرف سے ہے اوراس کا انجام اللہ کی طرف سے،کوشش کے بغیر توکل کا کوئی معنی نہیں اور توکل کے بغیر کوشش بے برکت ہے، اسباب دنیوی سے تعلق ختم کر دینا توکل نہیں توکل تو اسباب کے ساتھ ہوتا ہے۔حضور سید عالم ﷺ سے ایک اعرابی نے سوال کیا حضور! اونٹ کو کھلا چھوڑ کریا اس کا پاؤں باندھ کر توکل کروں، آپ ﷺ نے فرمایا پہلے اونٹ کا پاؤں باندھ پھر اللہ پر توکل کر، حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم نے توکل کی حقیقت کو پالیا ہوتا تو اللہ تمہیں پرندوں کی طرح روزی دیتا جو صبح بھوکے اٹھتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر آ جاتے ہیں،انسان کو چاہیئے جب رزق کے حصول کے اسباب مہیا کرے تو اسباب کی بجائے رب قدوس کو اپنا نصب العین بنالے جواصل میں روزی مہیا کرتا ہے۔

در یکے گفتہ کہ واجب خدمت است
ورنہ اندیشہ توکل تہمت ست

ایک دفتر میں یہ کہا کہ خدمت اور اطاعت واجب ہے ورنہ توکل کا خیال پیغمبر پر الزام کے مترادف ہوگا، اس سے پہلے ایک حکم میں یہ تھا کہ توکل کیلئے عبادت کی کیا ضرورت ہے اس شعر میں ہے کہ توکل کے ساتھ عبادت بھی ضروری ہے، اگر عبادت کے بغیر اکیلا توکل کافی ہوتا تو گویا خدا پناہ شریعت میں عبادات وطاعت کے احکام سب فضول تھے اور یہ خیال یہ تصور حضور ﷺ پر تہمت لگانے کی طرح ہے (معاذاللہ)

در یکے گفتہ کہ امر و نہی ہاست
بہر کردن نیست شرح عجز ماست

اس مکار وزیر کا ایک حکم یہ تھا کہ شریعت میں جو امر و نہی ہیں یہ عمل کرنے کیلئے نہیں بلکہ وہ صرف ہمارے عاجز ہونے کی دلیل ہیں۔

امر و نہی کا فلسفہ یہ بیان کیا کہ انسان اپنے عجز کو معلوم کرے اور خدا کو جان لے، مکار وزیر کا یہ حکم تھا کہ خدا کی طرف سے جو امر و نہی ہیں ان پر عمل نہیں ہونا چاہئے یہ اصول عمل کرنے کیلئے بنائے ہی نہیں گئے بلکہ مقصد صرف اتنا ہے کہ جب بندہ ان پر عمل کرنا مشکل سمجھے گا تو اُسے اپنا عجز معلوم ہو جائے گا۔ اہل اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ بندہ کسی حد تک تو مجبور ہے مگر مطلقاً مکمل طور پر مجبور نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے محنت کا اختیار دیا ہے جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اختیار دے دیتا ہے۔ مکار وزیر نے اپنے حکم میں انساں کو محض مجبور بتایا ہے یہ قطعی غلط ہے یہ عقیدہ جبریہ کا

ہے کہ انسان محض مجبور ہے۔

در یکے گفتار کہ عجز خود مبیں
کفر نعمت کردن ست آن عجز بیں

ایک حکم یہ دیا کہ اپنے کو عاجز مت سمجھ بلکہ کام کرتا رہ عجز کا عقیدہ احسان فراموشی ہے، وزیر کا یہ حکم بھی اسلامی روح کے خلاف تھا کہ اسلام عجز و انکساری، آہ و زاری کو ایک مقام دیتا ہے وزیر کا یہ فیصلہ حضورﷺ کے اس حکم کے خلاف ہے'' کن فی الدنیا کانك غریب اور کعا بری سبیل اور کما قال ﷺ '' دنیا میں ایسے زندگی بسر کر جیسے تو غریب ہے یا مسافر ہے، غریب اور مسافروں میں عجز و انکساری کا پہلو نمایاں ہے، وزیر کے حکم کا مفہوم یہ تھا کہ اپنے کو قادر سمجھ عاجز نہ سمجھ کہ قدرت رکھتے ہوئے اپنے کو عاجز سمجھنا خدا کی قدرت کا انکار ہے اور اس کی نعمت کا کفران ہے۔

در یکے گفتہ کزیں دو در گزر
بت بود ہرچہ بگنجد در نظر

ایک حکم اسی طرح جاری کیا کہ عجز اور قدرت دونوں کو چھوڑ ان دونوں میں سے جو تیرے دل میں سمائے گا وہ بت ہے، وزیر کے اس حکم میں پہلے دونوں مضامین کی تردید ہے نہ عجز اچھا ہے نہ قدرت اچھی ہے پہلے دونوں حکموں میں دو مختلف نظریات کا ذکر تھا دونوں نظریات سے مراد جبریوں اور قدریوں کا تصور ملتا تھا اس حکم میں جبر و قدر دونوں کی مخالفت ہے کہ یہ دونوں نظریئے بمنزلہ بت ہیں جو بندے کی توجہ کو اللہ سے ہٹا دیتے ہیں اسلام نے اس پیچیدہ مسئلہ کو آسان لفظوں میں حل کر دیا

ہے کہ انسان بعض معاملات میں مجبور ہے بعض میں اللہ کی دی ہوئی طاقت سے قادر ہے۔

از ہوائے خویش در ہر ملتے

گشتہ ہر قومے اسیر ذلتے

پہلے کہا تھا کہ عجز اور قدرت دونوں کو چھوڑ دے، اب ذکر ہے کہ جبر وقدر دونوں قابل توجہ نہیں ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ وہاں ان کے ترک کرنے کی ترغیب تھی اب یہ کہ ان کے ترک کرنے کا بھی اہتمام نہ کرو کہ وہ خود بخود ختم ہو جائیں گے کہ کسی شے کا ترک کرنا بھی خواہش نفس کی اتباع ہے اور جو لوگ اپنی خواہش کے تابع ہوتے ہیں وہ ذلت وخواری میں گرفتار ہو جاتے ہیں اسی مکار وزیر نے کسی حکم میں کہا کہ غور و فکر کی شمع کو گل نہ کر کسی حکم میں کہا کہ اس شمع کو بجھا دے کوئی حرج نہیں کسی حکم میں کہا کہ شمع عقل کے بجھانے سے روح ترقی کرے گی اور تیرا محبوب حقیقی تیری ثابت قدمی دیکھ کر مجنوں کی طرح تیرا مشتاق ہو جائے گا کسی حکم میں کہا جس شخص نے زہد سے دنیا چھوڑ دی دنیا خود اس کے آگے حاضر ہو گی اور پہلے سے زیادہ ہو گی کسی حکم میں کہا جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے اور تیرے لئے خوشگوار بنایا ہے اور پسندیدہ ٹھہرادیا اس کو حاصل کر۔ کسی حکم میں کہا اپنی حاصل کردہ چیزوں کو چھوڑ دے کہ تیری دل پسند چیز ناقابل منظوری ہے اور بری ہے۔

خلاصہ

حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ نے مکار اور فریبی وزیر کے گیارہ بارہ مختلف متضاد احکام بیان کر کے اس کی مکاری اور دھوکہ بازی کا ذکر کیا ہے، اس کی مکاریوں اور چالبازیوں کا ذکر فرما کر مثنوی کے قاری کو توجہ دلا رہے ہیں کہ تو بھی اپنے نفس کی مکاریوں سے محتاط رہ، تیرا نفس بھی تجھے ایسے ہی دھوکہ دے سکتا ہے جیسے مکار وزیر نے قومِ عیسیٰ کو دھوکا میں مبتلا کیا اور سیدھی راہ سے دور کیا، وزیر نے کسی حکم میں کچھ کسی میں کچھ کہہ کر لوگوں کو دھوکا دیا ایسے ہی نفس بھی غلط تاویلات کر کے گمراہ کر سکتا ہے۔ مکار وزیر کے احکام میں ثابت قدمی نہ تھی کہ کسی ایک حکم پر قائم رہتا، ایسے ہی نفس بھی صحیح راہ سے دور کرنے کیلئے کئی تاویلات کر کے گمراہ کر دیتا ہے اور استقامت سے محروم کر دیتا ہے اور قرآن مقدس کی اس نعمت سے دور کر دیتا ہے جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر پکے رہ گئے تو ہم ان پر رحمت کے فرشتے بھیجتے ہیں جو اُنہیں تسلی دیتے ہیں کہ کسی قسم کا خوف نہ کر غم نہ کر اور جنت کی بشارت دیتے ہیں۔

نفس امارہ کے شیطانی خیالات کو دور کرنے کیلئے اور باغی نفس کے قہر سے بچنے کیلئے چوکنا رہنا بڑا ضروری ہے، وزیر کی شرانگیزیوں سے سبق سکھایا جا رہا ہے۔
حضرت ابوالحسن رازی علیہ الرحمہ نے اپنی خواب میں ایک بزرگ کو جہنم میں دیکھا اور پوچھا حضرت صاحب آپ جہنم میں کیسے تو انہوں نے جواب دیا میرے نفس نے مجھے دھوکہ دیا اور جہنم پہنچایا۔ جناب حاتم اصم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں نفس میرا اصطبل ہے علم میرا ہتھیار ہے نا اُمیدی میرا گناہ ہے، شیطان میرا دشمن ہے اور میں اپنے نفس کو

فریب میں مبتلا رکھتا ہوں۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں ''افضل الجہاد جہاد بالنفس ''سب سے افضل جہاد نفس کے ساتھ جہاد ہے، صحابہ کرام جب جنگ سے لوٹتے تو فرماتے ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے مکار وزیر کی داستان کو لمبا کر کے نفس کے دھوکوں سے بچنے کا درس دیا ہے اور بھی کئی باتیں ہوں گی مگر مجھے جو کچھ پتہ چلا اشارہ کر دیا ہے۔

وحدت اندر وحدت ست ایں مثنوی
از سمک رو تا سماک اے معنوی

مکار وزیر کے مختلف احکام کو تفصیل سے بیان فرما کر فرماتے ہیں یہ مثنوی اسرار وحدت سے بھرپور ہے، اے طالب اے مثنوی کے شائق اس مثنوی کے ذریعہ سے زیر زمین سے بالائے فلک تک کی سیر کر لے۔ اوپر کے شعر میں وزیر کے مختلف احکام کا ذکر ہوا اس ضمن میں امتیاز اور اتحاد کا ذکر آ گیا اس مناسبت کی وجہ سے مولانا کا ذہن فوراً توحید کی طرف منتقل ہو گیا چونکہ حضرت مولانا کا ذہن نظریہ وحدت الوجود پر بڑا واضح ہے اس شعر میں بھی اپنے اُسی عقیدہ کو بیان کیا جا رہا ہے کہ یہ مثنوی اسرار وحدت سے بھرپور ہے اگر انہیں اسرار کو پالے تو عالم بالا کی سیر ہو سکتی ہے۔

مولانا رومی کے نزدیک وحدۃ الوجود کا نظریہ عظیم ترین روحانی مقام ہے اور تصوف کے سارے مدارج و مقامات پر محیط ہے۔ اولیاء کرام کے تمام روحانی تصرفات ذکر الٰہی سے ہوتے ہیں اور اس نظریہ وحدۃ الوجود میں یاد الٰہی کو زبردست

غلبہ ہے یہی مفہوم حدیث شریف سے اس طرح ملتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "من احب شیأ اکثر ذکرہ" جس کو کسی سے محبت ہو تو وہ اکثر ہی اس کا ذکر کرتا ہے اور اس نظریہ میں ذکر الٰہی کو غلبہ ہے اور ذکر کی کثرت فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ حضرت مولانا ذات خدا میں گم ہو جانے کیلئے اس نظریہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں جو شخص ذات رب قدوس میں فنا ہو کر بقا باللہ کا مقام حاصل کر لیتا ہے تو وہ کل شی ھالك کے حکم سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے۔ خدا کی ذات میں جو فنا ہو جائے وہ ہلاکت میں نہیں رہے گا۔

او ز یکرنگی عیسیٰ بوند اشت
وز مزاج خم عیسیٰ خونداشت

اوپر کے شعر وحدت اندر وحدت کے ذکر کے بعد پھر مولانا اُسی مکار وزیر کا ذکر فرماتے ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت کو نہ سمجھ سکا تھا بلکہ صرف یہودی بادشاہ کو خوش رکھنے کیلئے قوم عیسیٰ میں افراتفری پیدا کر رہا تھا، فرماتے ہیں اس وزیر کو عیسیٰ علیہ السلام کی یکرنگی کی خبر نہ تھی اور نہ ہی خم عیسیٰ سے متعارف تھا۔

مولانا فرماتے ہیں اس مکار وزیر کو عیسیٰ علیہ السلام کے کمالات کی خبر ہی نہ تھی، عیسیٰ علیہ السلام رنگ سازی کا کام کرتے تھے مگر اس کاروبار میں شان پیغمبری مکمل طور پر جلوہ گر تھی، کپڑے رنگنے کیلئے صرف ایک مٹکا موجود تھا گاہک کپڑے کا جو رنگ چاہتا آپ اُسی مٹکے میں ڈبو دیتے اور وہ گاہک کی مرضی کے مطابق اسی رنگ میں رنگا جاتا۔ ایک موقعہ آپ کسی انگریز کی دکان پر بیٹھے تھے اتنے میں آپ نے تمام گاہکوں کے کپڑے اٹھا کر ایک مٹکے میں ڈال دیئے، انگریز گھبرایا، تو آپ نے اُسے

تسلی دی اور فرمایا جو کپڑا جس رنگ کا چاہئے رنگ کا نام لے کر نکالتے جاؤ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور آپ کا یہ معجزہ دیکھ کر وہ انگریز ایمان لے آیا۔ مولانا فرماتے ہیں وزیر محض موسیٰ علیہ السلام کا متبع ہونے کے باعث عیسیٰ علیہ السلام کا مخالف ہو رہا تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخالف نہیں بلکہ ان کے ہم رنگ ہیں نہ صرف خود ہم رنگ ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اسی ایک رنگ میں رنگ دیتے ہیں مگر وہ اس اتحاد رنگ سے خوگر نہ تھا۔

گرچہ در خشکی ہزاراں رنگہاست
ماہیاں را بایبوست جنگہاست

فرماتے ہیں خشکی کے اندر ہزاروں رنگ ہیں کہیں مٹی ہے کہیں ریت ہے کہیں میدان ہیں کہیں پہاڑ ہیں مگر مچھلیوں کو خشکی کے ساتھ دشمنی ہے ان کو پانی پسند ہے اُسی میں رہنا زندگی ہے مچھلی پانی کی عاشق ہے اور عاشق اپنے عشق سے کبھی سیر نہیں ہوتا، یہ مثال عشاق پر چسپاں ہوتی ہے جس طرح مچھلی پانی سے سیر نہیں ہوتی اسی طرح عاشقان الٰہی عشق سے بس نہیں کرتے۔

کیست ماہی ؟ چیست دریا ؟ در مثل
تابداں ماند خدا عزّ و جل

صوفیاء کرام کبھی ذات قدوس جل مجدہٗ کو آفتاب سے تشبیہ دیتے ہیں کبھی سمندر سے۔ صوفیاء کے اس نظریہ پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہے کہ اس قسم کی تشبیہات اسلامی نظریات کے خلاف ہے حضرت مولانا نے اس شعر میں اس حقیقت کو واضح کیا

ہے کہ مچھلی کیا چیز ہے اور دریا کی شیٔ ہے جس کے ساتھ وحدت کی مثال میں رب قدوس جل مجدہٗ کو مشابہت ہو اس اشکال کا واضح جواب یہ ہے کہ تمثیل کیلئے صرف مناسبت کافی ہے اور تمثیل کا جواب قرآن مقدس سے ثابت ہے ''وللّٰہ المثل الاعلیٰ '' اور اللہ کی بہت بڑی مثال ہے دوسری جگہ اس طرح ارشاد ملتا ہے ''مثل نورہ کمشکوٰۃ ''اس کے نور کی مثال چراغ دان کی سی ہے جس میں چراغ ہے۔

صد ہزاراں بحر و ماہی در وجود
سجدہ آرد پیش آں دریائے جود

فرماتے ہیں موجودات میں سے لاکھوں دریا اور مچھلیاں اس دریائے کرم کے آگے سربسجود ہیں ۔ رب قدوس جل مجدہٗ کیلئے دریا میں تمثیل کیا حقیقت رکھتی ہے وہ خالق اور یہ مخلوق ذیل میں چند مثالیں بیان فرماتے ہیں جن سے ثابت ہوگا کہ تمام مخلوق خالق کی محتاج ہے اور مخلوق کی ہر ایک خوبی خالق کی خوبیوں کا پرتو ہے کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

نور خود را جلوہ کردہ در لباس ایں وآں
در جہاں آوازۂ کون ومکاں انداختہ

پس ذات قدوس جل مجدہٗ نے ایں وآں کے لباس میں جلوہ فرمایا ہے اور جہان میں کون ومکاں کا اعلان ہے۔

چند باران عطا باراں بدہ
تا بداں آں بحر در افشاں شدہ

اس شعر میں مثال فرماتے ہیں کہ رب قدوس کی بخشش کے کوئی مینہ دریا پر برسے یہاں تک کہ ان بارشوں سے وہ دریا موتی بکھیرنے لگا۔

فرماتے ہیں دریا کو جب موتی دینے کی صفت حاصل ہوئی کہ اس پر عطاء الٰہی کی بارش ہوئی تو دریا کی صفت عطا اللہ تعالیٰ کی صفت عطا کا مظہر بن گئی۔

چند خورشید کرم افروختہ
تا کہ ابرو بحر جود آموختہ

فرماتے ہیں اللہ کی بخشش کے کئی آفتاب چمکے تب بادل اور دریا نے فیض رسائی سیکھی۔ سورج کی گرمی سے پانی بخارات بن کر اوپر جاتا ہے پھر وہ بخارات بادل کی شکل اختیار کر جاتے ہیں اور پھر بادل برستے ہیں اور بارشوں سے دریا بنتے ہیں، بادلوں اور دریاؤں سے زمین کو فیض پہنچتا ہے ظاہر ہے کہ یہ سارا سلسلہ سورج کی گرمی کے سبب سے ہوا، حقیقت یہ ہے کہ رب قدوس جل مجدہٗ کے آفتاب کرم کی گرمی کا فیض ہے اسی وجہ سے آسمانی آفتاب نے اپنا عمل کیا اور اسی سے بادل نے جود اور دریا نے فیض سیکھا۔

خاک امین و ہرچہ دروے کاشتی
بے خیانت جنس آں برداشتی

زمین اس قدر امانت دار ہے کہ جو کچھ اس میں بویا جائے وہی اُگتا ہے کسی قسم کا فرق نہیں مولانا اس شعر میں توجہ دلا رہے ہیں کہ تو ہی امین ہے امانت کو امانت والے کے سپرد کرنے کا طریقہ زمین کے عمل سے سمجھ۔ رب قدوس فرماتا ہے ”ان اللہ

یــأمــر کــم ان تــؤدو الامــانات الی اھلھا ‘‘اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کے سپرد کرو۔

ایں امانت زاں عنایت یافتہ است
کافتاب عدل بروے تافتہ ست

فرماتے ہیں زمین نے یہ امانت داری کی صفت اس عنائیت کی بدولت حاصل کی ہے کہ اس پر عدل کے آفتاب نے طلوع کیا ہے اللہ تعالیٰ کی صفات سے ایک صفت عدل ہی ہے جس کیلئے امانت لازم ہے اس لئے کہ عادل کیلئے ضروری ہے کہ وہ حقدار کو اس کا حق پہنچائے اور یہی امانت کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے آفتاب عدل نے زمین پر اپنا پرتو ڈالا تو وہ امانت کی صفت سے موصوف ہوگئی۔

تا نشان حق نیابد نو بہار
خاک سرّ ہارا نسازد آشکار

پچھلے شعر میں ارشاد تھا کہ اللہ تعالیٰ کے آفتاب عدل نے زمین پر اپنا پرتو ڈالا تو وہ امانت کی صفت سے موصوف ہوگئی۔

اس شعر میں بھی اسی عنوان کو دہرایا جا رہا ہے کہ جب تک فصل بہار خدا کا حکم نہیں پاتی اس وقت تک زمین اپنی مخفی اشیاء کو باہر نہیں نکالتی ۔ گویا موسم اپنے عہد کا حاکم ہوتا ہے جو خاص قسم کے درختوں پودوں پر تصرف کرتا ہے اس کے تصرف کے ماتحت ہی درخت پوری زمین سے باہر سر نکالتے ہیں۔ مولانا فرما رہے ہیں کہ تمام قسم کے درخت سبزہ زار چمنستان کی تمام رونق خدائے قدوس کے حکم سے ہی ہے یہ اس کی

قدرت ہے کہ مٹی سے مختلف قسم کے بیل بوٹے اُگائے انہیں عمدہ لباس پہنایا، پھولوں سے گلستان چمکایا، طرح طرح کے میوے پھل پیدا کیئے جو مختلف ذائقوں سے مالا مال ہیں اور انسانوں کیلئے حسن و جمال ہیں۔

آں جوادیکہ جمادے بداد
ایں خبرہا دیں امانت دیں سداد

رب قدوس کی عظمت کو بیان کرتے ہیں کہ اللہ بہت بڑا کریم ہے جس نے زمین کو یہ پھل اگانے کا حکم دیا اور پھر پھلوں کے بیجوں کی امانت سپرد کی اور پھر امانت کی ادائیگی میں درستی عطا کی۔ اس شعر میں فرمایا یہ جا رہا ہے کہ زمین ایک جماد اور بے شعور شئ ہے مگر احکام خداوندی کو سننے سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور یہ عنوان قرآن مقدس کے اس ارشاد سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔''و ان من شئ الا یسبح بحمدہٖ ولکن لا تفقھون تسبیحھم '' ہر شئ اللہ کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہی ہے مگر تم اُسے سمجھتے نہیں۔

آں جماد از لطف چوں جاں میشود
زمہریر از قہر پنہاں میشود

پچھلے شعر میں اللہ کی طرف سے زمین کو پیغام آنے اور اس کے امانت دار ہونے کا ذکر فرمایا گیا، اس شعر میں بھی اسی عنوان کو دوسرے رنگ میں بیان کیا جا رہا ہے کہ فصل بہار اللہ تعالیٰ کی صفت لطف کی مظہر ہے جب زمین میں ایک طاقت پیدا ہو جاتی ہے تو اسی کے اندر سے بے شمار انگوریاں زمین سے نمودار ہو کر زمین کو باغ و

بہار میں بدل دیتی ہیں اور پھر سردی کا موسم آتا ہے تو وہی باغ و بہار اُجاڑ کا نقشہ بدل دیتا ہے جو خدائے قدوس کی قہاری کا نقشہ ہے، وہی ٹھوس زمین لطف کا نقشہ پیش کرتی ہے اور پھر موسم خزاں قہر کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

ہر جمادے را کند فضلش خبیر
عاقلاں را کردہ قہرِ او ضریر

اس کا دریائے فضل وکرم جب ہوش میں آتا ہے تو ہر بے حس کو باخبر بنا دیتا ہے اور جب اس کے قہر کی بجلی گرتی ہے تو اچھے اچھے عقل مند حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور وہ بجلی انہیں اندھا کر دیتی ہے۔

جان و دل را طاقت ایں جوش نیست
با کہ گویم در جہاں یک گوش نیست

اس شعر میں ایک کیفیت بیان کر رہے ہیں کہ رب قدوس کی قدرت کو دیکھ کر دل میں جو جوش پیدا ہوتا ہے وہ کس سے بیان کروں، دنیا میں اس کو سننے والا کوئی کان ہی نہیں، قدرت کے آثار بیان کرتے ہوئے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اور بیان کیا جائے اور اسرار الٰہیہ کھولے جائیں مگر پھر یہ دیکھ کر کہ کوئی غور وفکر سے سننے والا دکھائی ہی نہیں دیتا تو ضبط ہو جاتا ہے اور خاموشی کو ہی بہتر سمجھا جاتا ہے۔

ہر کجا گوشے بد ازوے چشم گشت
ہر کجا سنگے بُد ازوے یشم گشت

فرماتے ہیں اگر کہیں کوئی کان ایسا تھا جو سننے کے قابل تھا تو وہ اس کی بدولت فرط محبت سے آنکھ بن گیا اور جہاں کہیں پتھر کا سا سخت دل تھا وہ اس کے فیض سے ریشم کی طرح قیمتی اور نورانی بن گیا۔فرماتے ہیں جب طلب کا جوش اور قبول کی صلاحیت ہو تو سماع سے مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے بتانا یہ چاہتے ہیں کہ کمال حاصل کرنے کیلئے قابل جوہر کا ہونا ضروری ہے۔

کیمیا سازے ست چہ بود کیمیا
معجزہ بخشے ست چہ بود سیمیا

پچھلے شعر میں ارشاد تھا کہ کمال حاصل کرنے کیلئے جوہر کا قابل ہونا ضروری ہے،اس شعر میں قدرت خداوندی کا ذکر فرماتے ہیں کہ رب قدوس کی ذات بابرکات اصل موجد کیمیا ہے۔کیمیا کی کوئی حقیقت نہیں ذات رب قدوس ہی ہے جو معجزہ عطا کرتی ہے ،شعبدہ بازی اور جادو کی کوئی حقیقت نہیں فرماتے ہیں رب قدوس کی قدرت ہے کان کی آنکھ بن جاتی کہ حق الیقین سے عین الیقین حاصل ہو جاتا ہے اُسی کی قدرت ہے کہ پتھر ریشم کی صورت اختیار کر لیتا ہے فرماتے ہیں کیمیا کی کیا ہستی ہے کہ خود مؤثر ہو۔رب قدوس نے ہی کیمیا کو پیدا فرمایا، جادو کی کوئی حیثیت نہیں اللہ تعالیٰ معجزہ عطا فرماتا ہے جو جادو سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔

پیش ہستی او بباید نیست بود
چیست ہستی پیش او کورو کبود

اس شعر میں مولانا رب قدوس کی عظمت کو بیان کرتے ہیں فرماتے ہیں اس

کی ہستی کے آگے نیست و نابود ہو جانا چاہئے، اُس کے آگے اپنی ہستی ہے بھی کیا؟ کچھ بھی نہیں مشاہدہ حق کے سامنے یہ ہستی اندھی ہے اور غم دنیا سے سیاہ پوش ہے بتانا یہ چاہتے ہین کہ اپنی ہستی کا احساس ہی حجاب مشاہد ہے جس نے آنکھوں کو اندھا کر رکھا ہے اس حجاب کو اٹھا دینا چاہئے بس اس حجاب کا اٹھنا ہی بصیرت ہے۔

ور نبودے او کبود از تعزیت
کے فسردے ہمچو یخ ایں ناحیت

اس شعر میں مولانا نے طالب دنیا کی کیفیت بیان کی ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے میں اس کا دل اُلجھ رہا ہے اور مال و دنیا کے فقدان کی فکر اُسے پریشان کر رہی ہے فرماتے ہیں اگر دنیا دار دنیا کے غم کی وجہ سے سیاہ پوش نہ ہوتا تو اس طرف برف کی طرح کیوں جم جاتی اب اس کی حالت یہ ہے کہ دنیا کی فکر اُسے برباد کر رہی ہے۔ دنیادار کی مثال ایسے ہی ہے جیسے بلبل کو بہار کے چلے جانے کا صدمہ ہوتا ہے۔ بلبل کی حالت کو دیکھ کر کسی کو بھی رنگ و بو پر فریفتہ نہیں ہونا چاہئے۔ دنیا میں رہنے اور اس کے ساتھ چلنے کے سلسلہ میں قرآن مقدس کا یہ ارشاد سامنے رہنا چاہئے "ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة" اے ہمارے رب ہماری دنیا بھی اچھی کر اور آخرت بھی اچھی فرما۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ خَلْقِهٖ

بکھرے موتی

اس مثنوی کے اس پہلے حصہ کے اختتام پر قاری کے ذوق محبت کے پیش نظر حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ کے چند صوفیانہ نظریات کو ''بکھرے موتیوں'' کے عنوان سے پیش کیا جارہا ہے، عرصہ ڈیڑھ سال سے دائیں بازو میں تکلیف کے باعث لکھنے میں دِقت محسوس کرتا ہوں، خطرہ ہے کہیں اس تکلیف کے باعث مثنوی شریف کا ترجمہ بمعہ شرح مکمل نہ کرسکوں اوراس سعادت سے محروم رہ جاؤں، اسی وجہ سے ان کے چند ارشادات کوبکھرے موتیوں کے نام سے پیش کررہاہوں کہ مثنوی کا درس دینے والے صوفیاءاستفادہ کرسکیں، ہوسکےتو دعا کردیں صحت ہوشفا ہوتو پوری کتاب کا ترجمہ کر سکوں۔

شیخ کامل سے وابستگی

حضرت مولانا روحانی مدارج کو طے کرنے کیلئے شیخ کامل سے وابستگی کو بہت بڑی اہمیت دیتے ہیں، روحانی مقامات کو بارگاہ قدس تک پہنچنے کیلئے ایک شان دار سیڑھی قرار دیتے ہیں جس کے سبب عالم بالا کی بلندیوں پر پہنچ سکتا ہے، فرماتے ہیں

پیر باشد نرد بان آسماں
تیر پرّا از گرد از کماں

فرماتے ہیں روحانی آسمان پر جانے کیلئے مردمومن شیخ کامل کی دامنگیری سیڑھی ہے فرماتے ہیں تیر چلانے کیلئے کمان کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ روحانی

تیروں کیلئے شیخ کامل شاندار کمان ہوتا ہے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدَدِ خَلْقِہٖ

مقام فنا

صوفیاء کرام اپنے بقاء کیلئے اپنے فنا کو بہت بڑی اہمیت دیتے ہیں تکبر وغرور سے نفرت انا اور اکڑ بازی سے دوری کو اپنی فنا کی مرکزی اینٹ قرار دیتے ہیں۔ مولانا رومی علیہ الرحمہ نے اس مقام فنائیت کو اپنے اس شعر میں فرمایا ہے۔

گر ہمی خواہی کے بفروزی چو روز
ہستی ہمچوں شب خود را بسوز

فرماتے ہیں اگر تو چاہتا ہے کہ دن کی طرح روشن ہو اور سورج کی طرح تیرا فیض عام ہو اور اس کی روشنی کی طرح مشرق و مغرب میں تیری ضرورت ہو جیسے لاکھوں کروڑوں ستارے سورج سے فیض لیتے ہیں اور آگے پہنچاتے ہیں تو بھی ایسا ہی ہو تو پھر اپنی رات جیسی ہستی کو جلا کر فنا کردے تیری یہ فنا تجھے بقا میں بدل دے گی حضرت مولانا کا نظریہ ہے کہ اگر تو اپنے وجود کو عطا کرنے والے اللہ رب العزۃ کی ذات میں تانبے کی طرح کیمیا میں پگھلا دے گا تو منزل مقصود کو پالے گا۔ رب قدوس جل مجدہٗ کی افضل و اعلیٰ ہستی کے سامنے اپنے وجود کا اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا، جب محبوب حقیقی جلوہ گر ہو تو اپنی ہستی کو مٹانا ہی کمال بلندی ہے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہئے
دانا خاک میں مل کر گل و گلزار بنتا ہے

حضرت مولانا کا مؤقف ہے حق کے ساتھ کامل ہونے کی وجہ سے ہی مجھے اعلیٰ درجہ کا نور بصیرت نصیب ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدِدِ خَلْقِهٖ

مقام ولائیت

شیخ کامل کے بارہ میں مولانا کا نظریہ ہے کہ وہی خدا تک پہنچنے کی صحیح راہنمائی کرتا ہے، مولانا فرماتے ہیں لوگوں کو چاہئے کہ شیخ کامل کی باتوں سے اپنے دلوں کو مزین کریں تاکہ شیخ سے اسرار قلبی اور روحانیت حاصل کرسکیں۔ شیخ کامل کے بارہ میں مولانا کا نظریہ ہے کہ اس کا وجود قوم کی اصلاح کیلئے ایسے ہی ہوتا ہے جیسے نبی کا وجود اُمت کی اصلاح کیلئے ہوتا ہے۔ اس عنوان کو مولانا اپنے اس شعر میں فرماتے ہیں۔

گفت پیغمبر کہ شیخ رفتہ پیش
چوں نبی باشد میان قوم خویش

حضرت مولانا نے اپنے اس شعر میں الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ کے مفہوم کو بیان کیا ہے کہ شیخ اپنی قوم میں اصلاح اور بہتری پیدا کرنے کیلئے ایسے ہی ہوتا ہے جیسے نبی اپنی اُمت کیلئے ہدایت کا سبب بنتا ہے۔

شیخ کامل کی صحبت

فقر اور درویشی کے مقام تک پہنچنے کیلئے مولانا کا نظریہ ہے کہ شیخ کامل کی صحبت اختیار کی جائے ''الصحبۃ توثر و لوقل'' صحبت اثر انداز ہوتی ہے وہ تھوڑی ہی

کیوں نہ ہو۔صحابی کی عظمت ورفعت کا راز نبی کریم ﷺ کی صحبت وحاضری سے ہی ہے لاکھوں غوث قطب ابدال اکٹھے پرواز کر کے بھی بلال حبشی (رضی اللہ عنہ) کی ہوا نہیں پہنچ سکتے کہ حضرت بلال کو حضور ﷺ کی صحبت نصیب ہوئی ہے اور یہ غوث قطب ابدال اس نعمت سے محروم ہیں۔حضرت مولانا اس عنوان کی اہمیت کو اس شعر میں فرماتے ہیں۔

فقر خواہی آں بصحبت قائم است
نے زبانت کارمی آید نہ دست

اگر تو درویشی کے مقام سے آشنا ہونا چاہتا ہے تو وہ شیخ کی صحت پر موقوف ہے اس مقام پر جانے کیلئے نہ زبان کام آتی ہے نہ ہاتھ اس مقام تک جانے کیلئے مرید کی روح مرشد کامل کی روح سے سینہ بہ سینہ فیض حاصل کرتی ہے اور یہ فیض ہاتھ زبان کتاب سے حاصل نہیں ہوتا۔

وَصلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدَدِ خَلْقِہٖ

روحانی پرواز کیلئے تقویٰ شرط

حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ نے روحانیت کے بلند مقام کو پانے کیلئے تقویٰ پرہیزگاری اور زُہد کو لازم قرار دیا ہے، روحانی پرواز کرنے والوں سے فرماتے ہیں اگر تم بلندیوں پر جانا چاہتے ہو تو تمہیں نیکیوں کی طرف مائل ہونا چاہئے۔فرماتے ہیں جیسے جسمانی پہلوان بننے کیلئے پہلوانوں کی سی محنت ورزش ضروری ہے ایسے ہی روحانیت کے بلند مقام پر پہنچنے کیلئے عبادت، ریاضت، تقویٰ، پرہیزگاری کے اصول

اپنانے ضروری ہیں۔ مولانا نے اس عنوان کو اپنے اس شعر میں بیان فرمایا ہے

رستمی گر بایدت خنجر بگیر

در بخیری مائلی چادر بگیر

فرماتے ہیں جو لوگ بلندیوں پر جانا چاہتے ہیں انہیں نیکی میں دلچسپی لینی چاہئے فرماتے ہیں اگر رستم بننے کی خواہش رکھتے ہو تو پھر خنجر پکڑ واور میدان میں کودو، یہ میدان عبادت وریاضت، اخلاق حسنہ، اِخلاص انصاف کا میدان ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی صحیح ادائیگی اس میدان کو سَر کرنے کی کامیاب چابی ہے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدِدِ خَلْقِہٖ

اہل اللہ سے دوری خدا سے دوری ہے

حضرت مولانا نے اپنی کتاب مثنوی شریف میں اولیاء اللہ سے وابستگی اُن کی حاضری کو جگہ بہ جگہ اہمیت دی ہے کبھی کسی مثال سے سمجھایا کبھی کسی جگہ کوئی واقعہ سنایا غرضیکہ مثنوی شریف کے قاری کی اصلاح کیلئے اس عنوان میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ شیخ کامل کی اہمیت جو حدیث شریف میں ذکر ہے کہ رب ذوالجلال فرماتا ہے بندہ نفل پڑھ پڑھ اس قدر میرے قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے، پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اسی ارشاد کی روشنی میں فرماتے ہیں۔

چوں شوی دور از حضور اولیاء

در حقیقت گشتہ دور از خدا

اگر تو اولیاء کی حاضری سے دور ہو گیا تو حقیقت یہ ہے کہ تیری یہ دوری در اصل خدا سے دوری ہے۔ حضرت مولانا اہل اللہ سے تعلقات کی وابستگی اس عنوان میں بیان کرتے ہیں جیسے کوئی گداگر بھکاری منگتا بادشاہ سے عجز و انکساری سے مانگتا ہے تجھے بھی اولیاء اللہ سے فیض حاصل کرنے کیلئے یہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اس عنوان کو اپنے اس شعر میں فرماتے ہیں،

در بگوئی مشکل استفسار گو
با شہنشائی تو مسکین وار گو

فرماتے ہیں جیسے فقیر کو بادشاہ سے لینے کیلئے ہمت اور جرأت نہیں ہوتی ایسے ہی تجھے اہل اللہ سے بات کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدِدِ خَلْقِہٖ

اللہ والوں کو اپنے جیسا نہ سمجھ

انبیاء علیہم السلام کو کفار نے اپنے جیسا ہی آدمی سمجھا کہ وہ بھی عام انسانوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں کھاتے پیتے ہیں لوگوں کا یہ تصور ان کی گمراہی بے دینی کا سبب بن گیا حالانکہ انبیاء علیہم السلام پر وحی کے اترنے سے اُنہیں عام انسانوں سے بلند مقام دے دیا گیا چونکہ ولی اللہ بھی اپنی قوم میں اصلاح بہتری اور قوم کی اچھائی میں نبی کی طرح ہی کام کرتا ہے عام لوگ انہیں اپنے جیسا ہی خیال کر کے اُن سے دور ہو کر گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ مولانا ایسے ظاہر بین لوگوں کی ہدایت کیلئے فرماتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس از خود بگیر
گرچہ باشد دو نوشتن شیر و شِیر

فرماتے ہیں پاک لوگوں کو اپنے پر قیاس نہ کر اگر چہ لکھنے میں فقط شیر اور شِیر ایک ہی معلوم ہوتے ہیں مگر شیر ایک جنگلی جانور ہے اور شِیر پینے کا دودھ ہے۔ کھاری اور میٹھا پانی دیکھنے میں ایک جیسا ہی پانی ہے مگر پینے میں ایک کڑوا ہے دوسرا میٹھا۔ عام لوگ ظاہری شکل وصورت کو دیکھ کر اہل اللہ کو بھی اپنے جیسا ہی تصور کرتے ہیں جو غلط ہے یہ لوگ خدائے ذوالجلال سے قرب کی وجہ سے بہت بلند وبالا ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا نے اس عنوان پر اپنی مثنوی شریف میں بہت واضح تبصرہ کیا ہے، فرماتے ہیں فرعون کے جادوگروں کے کرتب اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں بہت بڑا فرق ہے۔ بظاہر تو عصا ہی سانپ معلوم ہوتا تھا، مومن اور منافق ایک جیسے ہی لگتے ہیں مگر فرق بہت بڑا ہے، مولانا فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ کسی کو رُسوا کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل کو اہل اللہ پر طعن اور ان کے خلاف بدگوئی پر مائل کر دیتا ہے اور وہ گستاخ لوگ اسی بک بک میں زندگی گزارنے کو اہمیت دیتے ہیں مگر اہل اللہ کو ان کی مخالفت دشمنی کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دولت سے نوازا ہوا ہے کہ خوف وغم دونوں سے آزاد ہیں مجھے کوئی مارنے کا ارادہ کرے مجھ پر لاٹھی اُٹھادے اس کے ایسا کرنے سے جو کیفیت مجھ پر طاری ہوگی وہ خوف ہے۔ اہل اللہ اس سے بھی بری ہیں مجھے کوئی مار رہا ہے کسی دوسرے کو میری حالت پر رحم آتا ہے تو یہ غم ہے اہل اللہ اس سے بھی محفوظ ہیں، اس دن انہیں اپنے عقیدت مندوں کی تکلیف کا غم بھی نہیں ہوگا کہ

اللہ انہیں اہل اللہ کے تعلق کی وجہ سے تکلیف سے محفوظ فرمائے گا، اللہ والوں کی مخالفت میں بربادی تباہی اور ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدَدِ خَلْقِہٖ

اللہ والوں کی حاضری

حضرت مولانا نے اہل اللہ کی صحبت میں بیٹھنے کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے سوسال کی بے ریا عبادت سے بھی اہم قرار دیا ہے یہ لکھتے ہوئے مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ حضور داتا گنج بخش علی ہجویری علیہ الرحمہ کے سالانہ عرس مبارک کی تقریب میں مجھے تقریر کیلئے بلایا گیا میں سعادت سمجھ کر حاضر ہو گیا، حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ کا یہ شعر یاد آ گیا۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء　　　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کہ ولی کی بارگاہ میں چند لمحات گزارنے سو سال کی بے ریا عبادت سے بھی اچھے ہیں، بھرے مجمع سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر تردید کی کہ یہ نظریہ صحیح نہیں، اس وقت جو مجھے جواب سوجھا یہ تھا اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ وہ اپنی انگوٹھی میں نگینہ جڑ لے مگر وہ بندہ سنار نہیں، اُسے نگینہ جڑنے کا طریقہ نہیں آتا اس پر وہ کئی گھنٹے گزار دیتا ہے مگر ناکام ہے اگر کوئی سنار اس پر رحم کھائے اور اس کے نگینے کو لمحہ میں ٹھیک کر دے تو ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی سمجھو اگر کوئی چاہتا ہے کہ اس کے دل میں عشق مصطفٰی کا نگینہ جڑ جائے مگر وہ اپنی نااہلی کے باعث ایسا کر نہیں سکا، اس کی پریشانی پر کسی ولی اللہ کو رحم آ جائے، داتا ہجویری اپنی عشق و محبت کی نگاہ سے ایک لمحہ میں ٹھیک کر دیں تو کیا بعید

ہے۔ حضرت مولانا کے شعر کا مفہوم بھی اسی پر قیاس کر لیا جائے اور پھر صحبت اثر کرتی ہے تھوڑی دیر ہی کیوں نہ ہو، صحابی کو مقام حضور ﷺ کی صحبت سے ہی ملا ہے کوئی غیر صحابی صحابی کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا عبادت و ریاضت کتنی ہی کیوں نہ کر لی ہو۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدَدِ خَلْقِہٖ

شیخ کامل دور نہیں ہوتا

حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ کا اولیاء اللہ کے بارہ میں نظریہ بڑا مضبوط ہے کہ وہ خدا کی طرف سے دی گئی طاقت کے ساتھ مختلف مقامات پر جلوہ گر ہو جاتے ہیں اور اپنے عقیدتمندوں کی دستگیری کرتے ہیں، عرصہ ۲۵ سال پہلے کی بات ہے میں حج پر گیا اور وہاں شدید بیمار ہو گیا علاج ہوتا رہا صحت نہ ہوئی واپسی پر مجھے جہاز میں لٹا کر کراچی لایا گیا، ڈاکٹر محمد حسن مرحوم کے گھر قیام تھا، میری حالت موت و حیات کی کشمکش میں تھی نہ بیٹھ سکتا، نہ پہلو بدل سکتا ایسی حالت میں مجھے حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ کا شعر یاد آیا۔

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست
دست او جز قبضہ ٔ اللہ نیست

شیخ کا ہاتھ دور تک پہنچ جاتا ہے اس لئے کہ اس کا ہاتھ اللہ کی قدرت کے بغیر کچھ نہیں۔

اسی دوران مجھے امام فخر الدین رازی علیہ الرحمہ کا واقعہ یاد آیا کہ آپ کو انتقال کے وقت شیطان نے ورغلایا کہ رازی تو بہت بڑا عالم ہے سوچ جو لوگ کہتے

ہیں کہ خدا ایک ہے بھلا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اتنے بڑے نظام کو چلانے کیلئے کئی خدا ہونے چاہئیں، آپ نے تردید فرمائی کہ نہیں خدا ایک ہی ہے، شیطان نے پھر دلیل دی آپ نے پھر توڑ دی اسی دوران آپ کے شیخ نجم الدین کبریٰ میلوں دور وضو فرما رہے تھے، نگاہ ولایت سے دیکھا کہ فخر الدین گھِر گیا ہے آپ نے وہیں سے پانی کا چھینٹا پھینکا جو فخر الدین رازی کے منہ پر پڑا اور ساتھ ہی فرمایا فخر الدین اس سے بچنے کیلئے کہو میں بغیر دلیل کے مانتا ہوں خدا ایک ہی ہے۔ یہ واقعہ بھی یاد آیا اور پھر مجھے اپنے شیخ حضور سیدنا خواجہ میاں علی محمد خاں علیہ الرحمہ کے بارہ میں خیال گزرا کہ میرا شیخ ہے تو کامل مگر میرے حال سے بے خبر ہے ورنہ میں بچ جاتا، بس یہی لمحہ تھا کہ خواب میں حضور میاں صاحب علیہ الرحمہ آئے اور فرمایا مولوی صاحب رومی نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک کہا ہے، فرمایا لو میں تمہارے لئے یہ مصلّی لایا ہوں اس پر لیٹ جاؤ میں حسب حکم مصلّی پر لیٹ گیا آنکھ کھلی ہے تو میری تکلیف کافی حد تک ختم ہو چکی تھی، خود ہی بیٹھا اُٹھا اور چلا۔ حضرت مولانا علیہ الرحمہ اپنے کاملین کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

ہمنشین اہل معنی باش تا　　　　ہم عطا یابی و ہم باشی فتیٰ

فرماتے ہیں اہل اللہ کی صحبت میں بیٹھ تا کہ تو بھی عارفین کاملین میں شمار ہو سکے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ خَلْقِهٖ

خدا کی ہم نشینی

اولیاء کاملین کے بارہ میں مولانا رومی علیہ الرحمہ کا نظریہ بہت بلند و بالا ہے فرماتے ہیں اگر کوئی چاہتا ہے کہ بارگاہ قدس رب العزۃ کا قرب پائے تو اُسے چاہئے

کہ اولیاء کاملین کی محفلوں میں بیٹھے۔ مولانا شیخ کامل کے اتحاد کو قرب خداوندی کا زینہ بتاتے ہیں شیطان انسان کا بدترین دشمن ہے جیسے بکریوں کا دشمن بھیڑیا ہے ایسے ہی انسان کا دشمن شیطان ہے اور شیطان انسان کے اندر وہاں وہاں چلتا ہے جہاں جہاں خون چلتا ہے جیسے حدیث شریف سے ظاہر ہے" ان الشیطان یجری مجری الدم "مولانا فرماتے ہیں شیطان کے مکروفریب اور ہتھکنڈوں سے نجات پانے کیلئے شیخ کامل کی صحبت ہی بہترین کامیاب علاج ہے، شیخ کامل کی صحبت سے راسخ عقیدہ کے مرید کو خدائے قدوس کی ہم نشینی کا شرف مل جاتا ہے، فرماتے ہیں

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا
او نشیند در حضور اولیاء

اگر کوئی چاہتا ہے کہ خدا کا قرب حاصل کرے تو اولیاء کاملین کی محفل اختیار کرے۔
وَصلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدِدِ خَلْقِہٖ

اولیاءاللہ دِلوں کے راز جانتے ہیں

اولیاء کرام کے بارہ میں مولانا روم علیہ الرحمہ کا نظریہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے دی گئی طاقت فراست سے دلوں کے رازوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے صوفیاء کرام نے کہا اولیاء کرام کے پاس جاؤ تو دل میں کوئی غلط نظریہ لے کر نہ جاؤ کہ وہ دل کے راز کو بھی جانتے ہیں، صوفیاء کہتے ہیں اولیاءاللہ دلوں کے جاسوس ہیں اس عنوان پر اہل اللہ کے بے شمار واقعات ملتے ہیں، سحری کے وقت یہ سطور لکھتے ہوئے مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا جو قارئین کیلئے ہدیہ ہے۔ جس سال یہود نے مسجد اقصیٰ پر

قبضہ کیا بے حرمتی کی، حج کے موقعہ پر مدینہ منورہ میں حاضری ہوئی تو صلوٰۃ وسلام پیش کرتے وقت یہ دردناک واقعہ سامنے آ گیا۔ بارگاہ رسالت میں رویا، عرض کی حضور مسجد اقصیٰ پر نظر فرمائیں، اسی مسجد شریف میں آپ نے انبیاء علیہم السلام کو نماز پڑھائی یہیں سے معراج شریف پر گئے، درد سے رویا التجائیں کیں، آہ وزاری دیر تک جاری رہی، دعا سے فارغ ہوا تو دیکھا میرے پیچھے شامی علماء کی ایک جماعت بھی کھڑی تھی جو میرے ساتھ روتی رہی انہوں نے مجھے کہا ہم تجھے شام کے ایک ولی کی زیارت کرائیں جو براہِ راست حضور ﷺ سے باتیں کر لیتے ہیں، میں نے انتہائی سعادت سمجھتے ہوئے ہاں کی، وہ مجھے مواجہہ شریف سے لے کر چلے، میں نے دل میں سوچا ایسے ولی سے ملاقات ہے اُن سے دو سوال کروں گا ایک تو یہ کہوں گا حضور کی بارگاہ میں میرا اسلام عرض کریں، دوسری درخواست کروں گا، حضور ﷺ سے عرض کریں مجھے آئندہ سال بھی حاضری نصیب ہو، جب ہم باب عمر رضی اللہ عنہ پہنچے تو وہی بزرگ ایک جماعت کے ساتھ حرم شریف میں داخل ہوئے اور آتے ہی محفل ذکر میں مصروف ہو گئے۔ میں بھی شامل رہا دعا کے بعد ان بزرگوں نے مجھے اشارے سے آگے بلایا اور فرمایا "بلغت منك السلام الى حضرة النبى الكريم "میں نے تیرا سلام حضور ﷺ سے عرض کر دیا ہے میری حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ یہ سوال کرنا تو میرے دل میں ہی تھا انہوں نے پہلے جواب دیدیا، ان کے کامل ولی ہونے پر اور زیادہ یقین ہو گیا، اب میں سوچ رہا تھا دوسرا سوال میں خود عرض کر دوں تو فرمایا " لا تحزن انك تاتى فى سنة الآتى " فکر نہ کر تو اگلے سال بھی آئے گا مجھے ان کی ولایت پر زبردست یقین ہو گیا۔ اولیاء اللہ کے بارہ میں اسی عنوان کو مولانا رومی علیہ الرحمہ نے

اس طرح بیان فرمایا ہے۔

آنکہ واقف گشت بر اسرار ہو
سرّ مخلوقات چہ پیش او

فرماتے ہیں جو بندہ رب ذوالجلال کے اسرار سے واقف ہو جائے اس کیلئے مخلوقات کے راز معلوم کرنا کونسا مسئلہ ہے، اسی عنوان کو دوسرے شعر میں اس طرح فرمایا

آنکہ بر افلاک رفتارش بود
بر زمین چہ دشوارش بود

جس شخص کی رفتار آسمانوں پر ہواُ سے زمین پر چلنا کیا مشکل ہے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدِدِ خَلْقِہٖ

نور مومن کی عظمت

حضرت مولانا رومی علیہ الرحمہ نے اپنی محبوب کتاب مثنوی شریف میں اولیاء اللہ کی عظمتیں برکتیں جابجا بیان کی ہیں کہ لوگ استفادہ کریں اور ان لوگوں سے وابستہ ہوں، مولانا فرماتے ہیں جب مومن کا دل یادالٰہی میں مصروف ہوتا ہے تو اس دل میں یادِ الٰہی کی ایسی کیفیت وحرارت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ حرارت دوزخ کی حرارت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، مومن جب پل صراط سے گزرے گا تو دوزخ کی پکار کیا ہوگی ’’جز یا مومن اطفأ نورك لهبی ‘‘اے مومن جلدی گزر جا تیرے نور نے میری آگ کو سرد کر دیا ہے۔ مولانا نے نور مومن کی عظمت کو اپنے اس شعر میں اس

طرح ذکر کیا ہے۔

گویدش بگزر زمن اے شاہ زود
ہیں کہ نورت سوزد نارم را ربود

یہ دوزخ کی پکار ہوگی، مومن جلدی گزر جا تیرے نور نے میری آگ کے سوز کو بجھا دیا ہے، مولانا فرماتے ہیں اگر جہنم کی آگ سے بچنا چاہتا ہے تو اہل اللہ کے نور سے وابستگی اختیار کر آگ کا نور کی ضد ہونا قیامت کو ظاہر ہوگا کہ اس دن جہنم کی آگ غضب الٰہی سے بھڑکی ہوگی اور مومن کا نور رب قدوس کے فضل و کرم سے باہیبت ہوگا۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدِدِ خَلْقِهٖ

نفس دشمنی میں قرب الٰہی ہے

حضرت مولانا نے اپنی کتاب کے شوقین لوگوں کیلئے قرب خداوندی کے طریقے بتائے ہیں، جن میں ایک طریقۂ قرب یہ بھی بیان کیا ہے کہ خواہشات نفس کو پامال کرو اور شیطان کے دوستوں سے الگ تھلگ رہو گے تو قرب خداوندی پاؤ گے، ملت اسلامیہ کا یہ ایک مسئلہ متفقہ ہے کہ انسان فرشتہ سے آگے ہے وہ کمالات جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیے ہیں فرشتہ ان سے محروم ہے، فرشتے ہر دم عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور کبھی بھی خدا کی نافرمانی نہیں کرتے ۔ یہ بھی یاد رہے درجات اس وقت بلند ہوتے ہیں جب کوئی کسی بری بات سے برے کام سے اپنے کو بچائے، نفس چاہتا ہے کہ برائی کرے مگر یہ بندہ نفس کی مخالفت کرتا ہے اور برائی سے رک جاتا ہے شرف

انسانیت کا یہی راز ہے کہ بندہ گناہ پر قادر ہے مگر پھر نفس کی خواہش کو پامال کردیتا ہے اسی باعث اس کو بلند مقام دیا جاتا ہے، فرشتہ گناہ پر قادر ہی نہیں تو گناہ نہ کرنے کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے، شیطان فرشتے کو گمراہ ہی نہیں کرسکتا غلط راہ پر چلا ہی نہیں سکتا تو اسے شیطان کی اتباع سے روکنے کا مسئلہ ہی نہیں، شیطان انسان کو دھوکہ دے سکتا ہے برائی پر آمادہ کرسکتا ہے تو انسانوں کو حکم دیا گیا شیطان کا اتباع نہ کرو وہ تمہارا دشمن ہے نفس کی شرارتوں سے بچے رہنے کے بارہ میں مولانا فرماتے ہیں۔

نفس تو با مست نقل است و نبید
وانکہ روحت خوشہ ٔ غیبی ندید

فرماتے ہیں جب تک تیرا نفس دنیا کی عیش و عشرت میں مست ہے تو یقین کرلے کہ تیری روح نے قرب حقیقی کا غیبی خوشہ دیکھا ہی نہیں ایک اور مقام پر اسی عنوان کو اس طرح فرماتے ہیں۔

زہر تن را نافع ست وقند نہ

عبادت و ریاضت کا زہر بدن کیلئے مفید ہے اور خلاف شریعت عیش و عشرت کا قند نقصان دہ ہے، نفس کی دشمنی سے مراد نفس امارہ کی مخالفت ہے ورنہ نفس لوّامہ یا نفس مطمئنہ تو اچھائی ہے۔

نفس پر قابو پانے کیلئے مولانا فرماتے ہیں تیرا سرکش اکھڑ نفس جو گدھے کی طرح ناچ کود رہا ہے، اسے قابو میں رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس پر شریعت کا بوجھ ڈال، اسے عبادت و ریاضت کے رنگ میں مصروف کر، اس کی خواہشات کو پامال

کرنے کیلئے ہر ممکن کوشش کرتا رہ ورنہ یہ سرکشی میں بڑھ کر تجھے گمراہی کے گڑھے میں ڈال دے گا نفس کی سرکشی کے ماحول میں آدمی رحمات وبرکات الٰہیہ سے محروم ہو جاتا ہے نفس کی سرکشی سے بچنے کیلئے روح کی قوت، دل کی اصلاح زبردست علاج ہیں، مولانا نفس کو سانپ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

نفست اژدہا ست او کے مردہ است
از غم بے آلتی افسردہ است

فرماتے ہیں تیرا نفس سانپ ہے جیسے سانپ ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے مردہ محسوس ہوتا ہے جونہی اسے گرمی پہنچتی ہے کاٹتا ہے، اپنی دہشت سے ڈراتا ہے یہی حال نفس کا ہے عارضی طور پر کمزور ہو تو موقع ملتے ہی اصلی خباثت پر آجاتا ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ خَلْقِهٖ

نفس پر قابو پانے کے بعد

جب کوئی بندہ احکام شریعت کی اتباع سے سرکش نفس پر قابو پا لیتا ہے تو وہ مقبولین بارگاہ کے زمرہ میں اولیاء کاملین کی فہرست میں آجاتا ہے، اس مرد مومن کی طاقت کو مولانا اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

اولیاء را ہست قدرت ازالہ
تیر جستہ باز گرداند زراہ

ایسے اولیاء کاملین کو اللہ کی طرف سے ایسی طاقت مل جاتی ہے کہ کمان سے

نکلے ہوئے تیر کو اس کے گرنے سے پہلے واپس کمان میں لا سکتے ہیں انہیں لوگوں کو وہ طاقت مل جاتی ہے کہ ان کی دعا سے لوحِ محفوظ کی تحریر بھی بدل جاتی ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمہ نے تفسیر مظہری میں ایک مقام پر مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کا واقعہ نقل کیا ہے آپ کے صاحبزادوں کو پڑھانے کیلئے ملا طاہر لاہوری آئے آپ نے ملا طاہر لاہوری کو دیکھا ان کے جانے کے بعد صاحبزادوں سے فرمایا بیٹو تمہارا استاد تو جہنمی ہے، بیٹوں نے جنتی بنانے کا اصرار کیا تو فرمایا میں لوحِ محفوظ پر دیکھوں گا، لوحِ محفوظ کو دیکھا تو وہاں بھی لکھا ہوا تھا یہ جہنمی ہے، بیٹوں سے فرمایا بیٹو میں کچھ نہیں کر سکتا ۔لوحِ محفوظ پر بھی اس کے جہنمی ہونے کی تحریر ہے، بچوں نے کہا بابا جی اگر وہاں پر لکھا ہوتا یہ جنتی ہے تو ہمیں آپ کی منتیں کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مجدد الف ثانی فرماتے ہیں بیٹوں کی اس بات نے مجھے حیران کر دیا تو مجھے غوث اعظم کی بات یاد آئی آپ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ میری دعا سے تقدیر بدل دیتا ہے، میں نے عرض کی اللہ اپنے بندے عبد القادر جیلانی کی دعا کے واسطہ سے ملا طاہر کی تقدیر بدل دے، چنانچہ تقدیر بدل گئی بجائے جہنمی کے جنتی لکھا گیا۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ خَلْقِهٖ

دنیا سے کنارہ کشی

حضرت مولانا نے روحانیت کو عروج پر پہنچانے کیلئے مثنوی شریف میں بہت سے طریقے بتائے، مثالوں سے سمجھایا اُن بے شمار طریقوں میں ایک طریقہ دنیا سے کنارہ کشی کا یہ بھی بتایا ہے کہ انسان کو چاہئے مخلوق کی دوستی کو چھوڑ کر رب قدوس

جل مجدہٗ کی ذات والا صفات سے دل لگائے ، دنیا سے لگاؤ اور تعلقات بس اسی دائرے میں ہوں جن کی شریعت اجازت دیتی ہے۔ دنیا کی زندگی گزارنے کے لئے ارشاد خداوندی ''ربنا آتنا فی الدنیا حسنہ '' کا وظیفہ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے۔ حضور سید عالم ﷺ کے ارشاد گرامی میں یہ عنوان اس طرح ملتا ہے '' الدنیا مزرعۃ الآخرۃ او کما قال ﷺ '' دنیا آخرت کی کھیتی ہے دنیا کی زندگی اعمال کا بیج بونے کا وقت ہے جس کی پیداوار قیامت کو کام آئے گی۔ حضور ﷺ کے اس ارشاد میں مومن کو کھیتی باڑی کا کام کرنے والے سے تشبیہ کا نشان ملتا ہے۔ جیسے کسان زمین میں بیج ڈالنے سے پہلے اُسے ہل چلا کر نرم کرتا ہے مومن کو بھی چاہئے کہ دل کی زمین کو اطاعت محبت کا بیج ڈالنے سے پہلے ریاضت کے ہل سے نرم کرے، مومن کو چاہئے جیسے کسان اپنی کھیتی کو پانی دیتا ہے یہ بھی اپنے دل کی زمین کو آنسوؤں کا پانی دیتا رہے۔ مومن کو بھی چاہئے جیسے کسان اپنی زمین سے بے تکی بوٹیاں گھاس کاٹ دیتا ہے یہ بھی دل کی زمین سے حسد غصہ کینہ کفر نفاق کی بوٹیوں کو اُکھاڑ باہر کرے، مومن کو بھی چاہئے جیسے کسان اپنی کھیتی کی حفاظت کرتا ہے کہ کوئی جانور برباد نہ کردے یہ بھی اپنے اعمال صالحہ کی کھیتی کی حفاظت کرے کہیں شیطان برباد نہ کردے جیسے کسان اپنی فصل کیلئے دعا کرتا رہتا ہے کہ ژالہ باری، شدید بارش نقصان نہ پہنچائے مومن کو بھی چاہئے کہ اپنے اعمال صالحہ کی حفاظت کیلئے نفس وشیطان کے حملوں سے بچنے کیلئے دعا کرتا رہے۔ مولانا اس عنوان پر فرماتے ہیں انسان کو چاہئے دنیا کی زندگی کو آخرت بہتر بنانے کیلئے غنیمت جانے اور لغویات سے بچ کر چلے بیج ڈالنے کے اس موسم سے فائدہ اُٹھائے اور بیج ڈال لے مولانا نے اس عنوان پر اپنے اس شعر میں اس طرح فرمایا ہے۔

آں کہ غافل بود از کشت بہار
او چہ داند قیمت ایں روزگار

جو بیج بونے کے موسم بہار سے غافل رہا وہ اس وقت کی قدر کیا پہچان سکتا ہے کہ وہ وقت کس قدر قیمتی تھا انسان کو چاہئے کہ اس وقت کی قدر کرے اور اعمال صالحہ کی کھیتی میں دل چسپی لے۔

وَصلَّی اللّٰہُ تعَالیٰ عَلیٰ حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدِدِ خَلْقِہٖ

صراط مستقیم کا سفر

مقام روحانیت کے حصول کیلئے صراط مستقیم پر چلنا نہایت ہی ضروری ہے صراط مستقیم وہ عظیم نعمت ہے جس کا ذکر قرآن مقدس نے سب دعاؤں سے پہلے فرمایا ''اھدنا الصراط المستقیم '' اے ہمارے اللہ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت فرما۔ علماء نے ہدایت کی کئی صورتیں بیان کی ہیں، ایک ہدایت فطری ہے جو ہر بچے کو ماں کے پیٹ میں ہی دے دی جاتی ہے بچے کا رونا، اُس کا دودھ پینا، ماں کی چھاتی کو زبان اور تالو کے درمیان دبانا وغیرہ دوسری ہدایت الٰہیہ یہ ہے کہ صرف مسلمان بچے کو نصیب ہوتی ہے اسی کا نام صراط مستقیم ہے اس ہدایت کے ملنے کا دروازہ صرف اور صرف سید الانبیاء حبیب کبریا ﷺ پر ایمان اور ان کی اطاعت ہے اسی راہ کو اپنانے اور خواہشات نفس سے بچنے سے قرب خداوندی کا دروازہ کھلتا ہے اور کائنات تابع ہو جاتی ہے پھر اسی بندے کے حکم کو کائنات کا ہر ذرہ مانتا ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں میں نے ایک عجیب منظر دیکھا ایک بندہ شیر پر سوار آ رہا ہے، اس عجیب

اور عظیم منظر سے میں گھبرا گیا قدم اٹھانے کی ہمت نہ تھی شیر پر سواری کرنے والا یہ بندہ جب میرے قریب آیا تو مجھے کہا

تو ہم گردن از حکم داور پیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

اس نے کہا تو خدا کے حکموں کی اطاعت کر ساری کائنات تیرے تابع ہو جائے گی۔

فرماتے ہیں جب فقیر صراط مستقیم پر آ کر خواہشات نفسانیہ سے پاک ہو جاتا ہے تو پھر اسے خدا کا قرب نصیب ہو جاتا ہے اللہ کی دوستی مل جاتی ہے پھر اس طرح شیر کا شکار بھی تمہارا حال بن جاتا ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ خَلْقِهٖ

حسد کی مذمت

حضرت مولانا نے روحانی مقامات حاصل کرنے میں بہت سی برائیوں رکاوٹوں کا ذکر بھی کیا ہے، اُن رکاوٹوں سے ایک بڑی رکاوٹ حسد بھی ہے اور یہ برائیوں کا سر چشمہ ہے کمینی حرکت ہے کسی کے کمال، مرتبہ عظمت کو دیکھ کر جلنا حسد ہے اس بیماری کے بارہ میں حضور سید عالم ﷺ کا ارشاد ملتا ہے "الحسد تاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب او کما قال ﷺ" حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اس رذیل بیماری سے بچنے کے سلسلہ میں صوفیاء نے کئی علاج بتائے ہیں، ایک کامیاب علاج تو یہ ہے کہ آدمی یہ عقیدہ بنا لے کہ جس شخص کے کمال سے وہ حسد کر رہا ہے وہ کمال وہ دولت وہ عظمت اُسے خدائے

ذوالجلال نے دی ہے اور خدا کی طرف سے دی گئی کسی شئی کو کوئی دوسرا ختم نہیں کر سکتا ۔ اس کے حسد سے اُس کی نعمت ختم نہیں ہو سکتی کہ وہ نعمت اُسے خدا نے دی ہے حاسد خود ہی اپنے حسد کی آگ میں جل کر برباد ہو جاتا ہے، حاسد کی نیکیاں برباد ہوتی ہیں جب کہ جس بندہ سے حسد کیا جا رہا ہے اس کی نیکیوں کے ڈھیر میں برکت ہوتی ہے اگر حاسد چاہتا ہے کہ اس بیماری سے نجات حاصل کرے تو اس عقیدہ کو مضبوط بنا لے کہ اس کا حسد خدا کی عطا کو ختم نہیں کر سکتا، ایک علاج یہ بھی ہے کہ حسد کرنے والا اپنے محسوس کے بارہ میں گاہے بگاہے اچھی باتیں کہتا رہے کبھی اسے شرم آئے گی کہ میں اس کی تعریف بھی کرتا ہوں اور اس سے جلتا بھی ہوں تو کسی حد تک اصلاح کی راہ کھل جائے گی ۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں حسد اور طمع ایسی رذیل بیماریاں ہیں جیسے یہ دونوں لفظ نقطوں سے خالی ہیں ایسے ہی حاسد اور طامع رب کی رحمت سے خالی ہوتے ہیں، حسد کی بیماری سے بچنے سے متعلق مولانا اپنے اس شعر میں فرماتے ہیں:

با ہوا ذر آرزو کم باش دوست

چو یضلک عن سبیل اللہ اوست

فرماتے ہیں ہوا و حرص ایسی خواہشات سے دور رہ کہ یہ بری عادتیں تجھے خدا سے دور کر دیں گی، ہوا و حرص حسد ایسی بیماریوں کا شاندار علاج شیخ کامل کے ہاتھ میں ہاتھ دینا بھی ہے فرماتے ہیں

ایں ہوا را نشکند اندر جہاں　　　　ہیچ چیزے ہمچو سایہ ہمرہاں

ان بیماریوں کا علاج شیخ کامل کے بغیر مشکل ہے۔

خودثنائی

مقام روحانیت سے محروم رہنے کیلئے کئی بیماریاں ہیں اگر اُن بیماریوں میں سے انسان کو کوئی بیماری لاحق ہو جائے تو اس کی روحانی ترقی رک جاتی ہے، ان بیماریوں سے ایک بیماری خودثنائی بھی ہے، اپنی تعریف کرنا اپنے کو برگزیدہ سمجھنا جب کوئی بندہ اپنے کو کمزور حقیر مجرم سمجھ کر چلتا ہے تو اس کی روحانی ترقی بڑھتی رہتی ہے، اس کا اپنے کو گنہگار کہنے ماننے کا احساس اُسے بلندیوں کی طرف لے جاتا رہتا ہے، جب اپنے کو کامل سمجھنے لگ جائے تو ترقی رک جاتی ہے، یہ ذلیل قسم کی بیماری سب سے پہلے ابلیس میں آئی جب اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں وہ تو مٹی سے بنایا گیا اور میں آگ سے، یہ میری فضیلت ہے اس کی ہی خودثنائی اس کی رسوائی و ذلت کا سبب بن گئی۔ دل کی بیماریوں سے یہ بیماری سخت تباہ کن ہے اس بیماری کا علاج عجز ہے انکساری ہے اللہ کے حضور آہ و زاری ہے اپنے کو گنہگار سمجھ کر توبہ استغفار کی کثرت ہے شہرت سے نفرت ہے۔ ایک غلام نے اپنے مالک سے کہا میں غلامی میں کمی نہیں کروں گا مگر ایک شرط ہے رات کو مجھ سے کام نہ لیا جائے میرے کمرے میں کوئی نہ آئے، ایک دن مالک نے اُسے رات کو دیکھا تو اس پر نورانی قندیل تھی صبح کو غلام نے کہا مجھے آزاد کر دیجئے میرا راز ظاہر ہو گیا ہے اب میں آگے نہیں چل سکتا ''ولا ارید حیاتی بعد ما اشتهر'' اس روحانی راز کے کھل جانے کے بعد اپنی زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

اس عنوان کو مولانا روم علیہ الرحمہ اپنے اس شعر میں فرماتے ہیں:

علتے بد تر زپندار کمال
نیست اندر جانت اے مغرور ضال

فرماتے ہیں اے مغرور گمراہ غور کر تیری روح کیلئے اپنی تعریف، خود ثنائی اور باکمال ہونے کے گھمنڈ سے زیادہ مہلک اور تباہ کن کوئی بیماری نہیں۔

علّت ابلیس انا خیر بدست
زیں مرض در نفس ہر مخلوق ہست

ابلیس کی یہ بیماری کہ میں ہر طور پر اچھا ہوں یہ بیماری ہر مخلوق کے نفس میں ہے (اللہ پناہ دے)

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدِدِ خَلْقِہٖ

خدا کے ڈر سے رونا روح کی ترقی ہے

جہاں روحانیت کیلئے بے شمار رکاوٹیں ہیں وہاں ترقی کیلئے ہزاروں حسین کام بھی ہیں ان مبارک کاموں میں ایک یہ بھی ہے کہ بندہ خدا کے ڈر سے روئے، آنسو بہائے، اس کا یہ عمل اُسے قیامت کے دن دوزخ سے بچالے گا۔ اس عنوان پر حضور ﷺ کا ارشاد اس طرح ملتا ہے ''لا یلج النار من بکی من خشیۃ اللہ حتی یعود اللبن فی الفرع او کما قال ﷺ '' جو شخص خدا کے ڈر سے رویا وہ دوزخ میں نہیں جائے گا اس کا دوزخ میں جانا ایسے ہی محال ہے جیسے گائے بھینس کے تھنوں سے نکالا گیا دودھ دوبارہ تھنوں میں جانا محال ہے یہ بھی یاد رہے خدا سے ڈرنے کیلئے خدا کا

علم ہونا ضروری ہے اگر خدائے ذوالجلال کی ذات کا علم نہیں تو پھر ڈر بھی پیدا نہیں ہوگا۔ شیر کو جاننے والا شیر کی دھاڑ گرج سے ڈر جائے گا مگر معصوم بچہ جو جانتا پہچانتا ہی نہیں اس کے سرہانے شیر دھاڑتا رہے اُسے خوف نہیں ہوگا کہ وہ شیر کو جانتا ہی نہیں۔رب قدوس کو جاننے کیلئے قرآن وحدیث کے ارشادات کا مطالعہ ضروری ہے۔

امام محمد غزالی علیہ الرحمہ نے ایک روایت نقل کی ہے قیامت کے دن دوزخ کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے اور تیزی سے آگے بڑھ رہے ہوں گے حضور ﷺ دیکھ کر پریشان ہوں گے کہیں یہ شعلے میری امت کو جلا نہ دیں، حضور ﷺ کی اس پریشانی کو جبریل دیکھ کر پوچھیں گے یارسول اللہ پریشان کیوں ہیں، فرمائیں گے بھڑکتے شعلوں سے امت کے جلنے کا ڈر ہے جبریل عرض کریں گے حضور میں پانی لاتا ہوں آپ وہ پانی دوزخ کی طرف چھڑک دیں، جبریل ایک پیالے میں پانی پیش کریں گے حضور ﷺ جہنم کی طرف چھڑکا دیں گے شعلے رُک جائیں گے حضور فرمائیں گے جبریل یہ پانی کیسا ہے؟ کہ چند چھینٹوں نے شعلے بھسم کر دیئے ہیں جبریل عرض کریں گے حضور یہ پانی آپ کی امت کے ان لوگوں کے آنسو ہیں جو خدا کے ڈر سے روتے تھے میں اس پانی کو جمع کر لیتا تھا، مولانا رومی علیہ الرحمہ نے اس عظیم عنوان کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

جاں چہ باشد با خبر از خیر و شر
شاد با احسان و گریان از ضرر

فرماتے ہیں روح کی کامیابی اس کی ترقی یہ ہے کہ وہ خیر وشر سے واقف ہو

نیکی وجی سے خوش ہو برائی سے غمگین ہو اور خدا کے حضور رونے والی ہو، دوسری جگہ فرماتے ہیں

پیش تو بس قدر دارد چشم تر
من چگو نہ گشتمے استیزہ گر

فرماتے ہیں اللہ کے ہاں جو رونے کی قدر ہے وہ کسی کے ہاں نہیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ خَلْقِهٖ

روح کی پرواز

روح کا اصل وطن تو عالم ارواح ہے مگر حکمت خداوندی مشیت ایزدی کے پیش نظر یہ جسم میں مقیّد ہے کہ جسم اور روح دونوں سے انسان کا وجود ہے مگر ملک دونوں کے الگ الگ ہیں جسم کو زمین سے تعلق ہے اور روح کو عالم بالا سے۔قدرت کو منظور تھا کہ دونوں کو یکجا کر کے انسان بنا دے چونکہ جسم اور روح دونوں کے ملک الگ الگ ہیں اس لئے ان کے مزاج خوراک بھی الگ الگ ہیں، غالبًا فلسفہ بھی یہی ہے کہ جسم کو زمین سے تعلق ہے،اس لئے اس کی ساری ضروریات بھی زمین سے وابستہ ہیں کھانا پینا پہننا علاج معالجہ وغیرہ سبھی ضروریات زمین سے پوری ہوتی ہیں، روح کا تعلق عالم بالا سے ہے اس لئے اس کی ضروریات کا تعلق بھی عالم بالا سے ہے جسم کے کھانے پینے سے اسے کوئی فائدہ نہیں، روح بھوکی تو مر جائے گی مگر جسم کی خوراک نہیں کھائے گی ،اب انسان کو یہ کیسے پتہ چلے کہ اس کی روح زندہ ہے یا مردہ تو صوفیاء بتاتے ہیں اگر گناہ ہو جانے کے بعد آدمی نفرت محسوس کرتا ہے ،اپنے اس گناہ پر

شرمسار ہوتا ہے تو یہ نشانی روح کی حیات کی دلیل ہے، اگر گناہ ہو جانے پر فخر کرتا ہے تو یہ نشانی روح کی موت کی ہے اقبال مرحوم نے اس عنوان کو اچھا بیان کیا ہے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

کہتے ہیں گناہ ہونے پر شرم و حیاء سے بہنے والا آنسو بارگاہ قدس میں موتیوں کی قیمت پاتا ہے۔ روح انسان کو بلندی کی طرف لے جاتی ہے اس عنوان کو مولانا رومی علیہ الرحمہ اس طرح فرماتے ہیں۔

روح مے بردت سوئے عرش بریں
سوئے آب و گل شدی در اسفلین

روح تو تجھے عرش بریں کی طرف لے جاتی ہے مگر تو پانی اور مٹی کی طرف نچلے درجہ میں آ گیا ہے۔ جسم کو اچھی خوراک ملے تو پہلوان ہو جاتا ہے، اکی، انو کی ناموں سے مشہور ہو جاتا ہے روح کو معیاری خوراک ملتی رہے تو ولی بن جاتا ہے تو عبدالقادر، فریدالدین، معین الدین کہلاتا ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ خَلْقِهٖ

مشائخ کی حاضری

مولانا رومی علیہ الرحمہ روحانی اصلاح کی ترقی اور فروغ کیلئے اہل اللہ کی بارگاہ میں حاضری کو بڑی اہمیت دیتے ہیں ان کا موقف ہے، طریقت کیلئے مرشد کامل کے حضور حاضری زبردست ہتھیار ہے ان کا موقف ہے علم تو کتابوں سے ملتا ہے مگر فقر

درویشی اہل اللہ کی حاضری سے ملتی ہے۔اس مسئلہ کو مثال دے کر اس طرح سمجھاتے ہیں کہ نمک کی کان میں گدھا گرا تو نمک ہو گیا اللہ والے کی محفل میں اگر بے شعور ان پڑھ حاضر ہوا تو اس کا رنگ ڈھنگ بھی یقیناً بدل جائے گا فرماتے ہیں،

ہیزم تیرہ حریف نار شد
تیرگی رفت وہمہ انوار شد

تاریک ایندھن آگ کا حریف بن جاتا ہے اس کا اندھیرا پن چلا جاتا ہے اور مجسم نور بن جاتا ہے فرماتے ہیں اگر جانور ہنر کرتب سیکھ لیتا ہے اور بندے کی محفل جانور کو سجھا بجھا دیتی ہے تو شیخ کامل کی حاضری سے بندے کی اصلاح کیسے نہیں ہو گی، دوسری جگہ فرماتے ہیں،

بلکہ خود از آدمی در گاؤ خر
مے رود دانائی و علم و ہنر

فرماتے ہیں اگر جانور بندے سے کرتب سیکھ لیتا ہے اور بندے کی محفل جانور کو سلجھا دیتی ہے تو شیخ کامل کی حاضری سے بندہ محروم کیسے رہ سکتا ہے؟

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدِدِ خَلْقِهٖ

میرا دل مرکز انوار کیوں نہیں؟

انسانی دل بہت بڑی شیٔ ہے اور یہی دل انسانی اعضاء کا سربراہ اور حکمران ہے انسانی دل میرے اعضاء کی فوج کا چیف ہے یہ مقدس عضو جب دنیا کے خیالات،

شہوات سے ملوث ہو جاتا ہے تو پھر اپنے حقیقی مقام سے گر جاتا ہے پھر یہ قلب سلیم نہیں رہتا اور قلب سلیم کا ہونا اتنا بڑا عظیم انعام ہے کہ قیامت کے دن جب مال اولاد کام نہ آسکیں گے قلب سلیم کام آئے گا جیسے قرآن مقدس فرماتا ہے ''الا من اتی اللہ بقلب سلیم '' قیامت کو بارگاہ قدس میں سرخروئی اُسی کی ہوگی جو قلب سلیم کے ساتھ حاضری دے گا۔

حرص و ہوا شہوات انسانی دل کو میلا کر دیتی ہے اسی وجہ سے میرا دل مرکز انوار بننے کی سعادت سے محروم ہو جاتا ہے، مولانا فرماتے ہیں

آئینہ ات دانی چرا غماز نیست
زانکہ زنگار از رخش ممتاز نیست

تجھے پتہ ہے تیرا آئینہ مرکز انوار کیوں نہیں، اس لئے کہ اس کے چہرے سے زنگار الگ نہیں ہوا۔ فرماتے ہیں اگر تو چاہتا ہے کہ تیرا دل مرکز انوار بن جائے تو پھر ضروری ہے کہ دل کے چہرے سے زنگ کو پاک صاف کرے پھر یہ روشن و منور آئینہ کائنات بھر کو اپنے اندر سمو لے گا اور مرکز انوار و تجلیات بن جائے گا۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدَدِ خَلْقِہٖ

خاک سے افلاک تک

حضرت مولانا نے اپنی کتاب مثنوی شریف میں انسان کو بلندیوں تک پہنچنے کے رازوں سے آگاہ کیا ہے اور وہ مخفی راستے بتائے ہیں جن پر چل کر بندہ منزل مقصود کو پا سکتا ہے، انسانی تخلیق مٹی سے ہوئی مگر اسے عروج یہ نصیب ہوا کہ تمام فرشتوں کو

حکم دیا گیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو یہ سجدہ تعظیمی تھا عبادت کا نہیں مگر آج کسی کو سجدہ تعظیمی کی اجازت ہی نہیں، پہلی قوموں میں جائز رہا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے سجدۂ تعظیمی کیا، ہماری شریعت مطہرہ میں ناجائز قرار دے دیا گیا جو بعض لوگ اپنے بزرگوں کیلئے سجدہ تعظیمی کے جواز کے قائل ہیں غلطی پر ہیں مولانا فرماتے ہیں عجز وانکساری آہ وزاری سے زندگی گزاراور بلندیوں کو چھولے افلاک تک پہنچ جا، مولانا روحانیت کے عروج کیلئے عجز وانکساری کو بہت اہمیت دیتے ہیں، فرماتے ہیں

دانۂ ہر میوہ چوں گردد دفین

بعد ازاں سر ہا بر آور از زمین

ہر میوے کا بیج زمین میں ہوتا ہے زمین میں دفن ہونے کے بعد وہ بیج حسین قسم کی شاخیں نکالتا ہے اس مسئلہ کو مزید اس طرح واضح کیا کہ تمام نعمتوں کی اصل آسمان سے مٹی تک نیچے آئی تو پھر انسانی جان کی غذا بنی اس کے بعد انسان خوش ہو گیا اور عرش تک پرواز کر گیا۔

پس صفات آدمی شد آں جہاد

بر فراز عرش پرّاں گشت شاد

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیا جائے تو حرج نہیں کہ انسان فنا سے نکل کر بقا تک پہنچ گیا روحانیت کا آسمانوں کی بلندیوں سے آگے نکل جانے کا فلسفہ بھی یہی سمجھ آتا ہے کہ روح کا اصل وطن ہی عالم بالا ہے وطن سے دور رہنے والا اپنے وطن کو ڈھونڈتا ہے اور پالیتا ہے فرماتے ہیں

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش

باز جوید روزگار وصل خویش

اپنے اصل سے دور ہونے والا وہ پھر وصل کا زمانہ تلاش کرتا ہے۔

وَصلّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلیٰ حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدَدِ خَلْقِہٖ

ذکر وفکرِ خداوندی

روحانیت کو مقام عروج تک پہنچانے اور منزل مقصود تک پہنچانے کیلئے مولانا رومی علیہ الرحمہ جہاں بہت سے راستے بتاتے ہیں اُن میں ایک اہم راستہ عظیم شاہرہ ذکر الٰہی بھی بتایا ہے، خدا کی یاد اتنا بڑا وسیع حسین راستہ ہے اس راہ پر چلنے والے کیلئے حکم ہوتا ہے ''فاذکرونی اذکرکم '' تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا خدا کی یاد سے مراد صرف یہی نہیں کہ بندہ ہر لمحہ اللہ اللہ کرتا رہے نماز پڑھتا رہے بلکہ یہ بھی ذکر الٰہی ہے کہ گناہ کرتے خدا یاد آجائے اور اس کے ڈر سے گناہ سے رک جائے یہ صورت بھی ذکر خداوندی میں شامل ہے ذکر وفکر کی نعمت سے ایسے راز کھلتے ہیں کشف ہوتے ہیں کہ بندہ زمین پر بیٹھا لوح محفوظ کی تحریریں پڑھ لیتا ہے، صوفیاء کے نزدیک ذکر الٰہی سے مراد اپنے دل پر الا اللہ کی ضرب لگانا ہی ہے۔ اسی عنوان کو ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار

جب تک نور سے ضرب کلیمی سے نہ چیرے

عارف رومی علیہ الرحمہ نے اللہ اللہ کے ذکر کے بارہ میں اس طرح لکھا ہے

نے ترا درکار من آوردہ ام
نے کہ من مشغول ذکرت کردہ ام

اللہ فرماتا ہے میرے بندے اس کام میں تجھے لگانے والا میں ہی ہوں بلکہ ذکر میں تجھے مصروف کرنے والا بھی میں ہی ہوں۔

دوسرے مقام پر اسی عنوان کو اس طرح بیان فرماتے ہیں

ترس و عشق تو کمند لطف ماست
زیر ہر یارب تو لبیک ماست

میرے بندے تیرے اندر میرا ڈر میری محبت میرا عشق میری مہربانی ہے اور تیرے ہر بار یارب کہنے میں میری طرف سے بہت سے لبیک ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں اللہ اللہ کرنے کی گرمی فکر کو حرکت میں لے آتی ہے تجھے چاہیئے یادِ خداوندی کو آفتاب سمجھے جس کی تمازت اور روشنی سے ہزاروں پیچیدگیاں حل ہوتی ہیں فرماتے ہیں۔

فکر آں باشد کہ بکشاید رہے
راہ آں باشد کہ پیش آید شہے

فکر وہ ہے جو راستہ کھول دے اور راستہ وہ ہے جو محبوب حقیقی کو ملا دے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ خَلْقِهٖ

تلاش محبوب

روحانیت کو مقام عروج تک پہچانے کو تلاش محبوب کے عنوان سے تعبیر کرلیا جائے تو بھی بہتر ہے۔ حضرت مولانا نے اس عنوان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جس حق کی تجھے تلاش ہے جس کیلئے تو مارے مارے پھر رہا ہے اس حق تک جانے کیلئے تو دور دراز راہوں میں سرگرداں ہے وہ حق تو تیرے اندر موجود ہے، قرآن مقدس کا یہ ارشاد تیری راہنمائی کررہا ہے ''نحن اقرب الیہ من حبل الورید'' ہم شہ رگ سے بھی قریب ہیں اس نکتہ کو پہچان لے محبوب مل جائے گا۔

اس ضمن میں صوفیاء کا موقف بڑا واضح ہے فرماتے ہیں ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' جس شخص نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے رب قدوس کو پہچان لیا اس حقیقت کو نہ سمجھنے والے حق کی راہ سے بہت دور ہو جاتے ہیں اور محبوب تک یہ راہ پانے کیلئے کئی مشکلات میں پھنس جاتے ہیں۔ مولانا نے اس عنوان کو اپنے اس ارشاد میں واضح کیا ہے

آنچہ حق است اقرب از حبل الورید
تو فگندہ تیر فکرت را بعید

فرماتے ہیں حق تو شہ رگ سے بھی نزدیک ہے، تو نے اپنی سوچ کے تیر کو بہت دور پھینکا ہے اس عنوان کو اپنے دوسرے شعر میں اس طرح فرمایا

جاہدو فینا بگفت آں شہر یار
جاہد و عنّا نہ گفت اے بے قرار

جن لوگوں نے ہمارے ہاں آنے کیلئے شہ رگ کے قرب سے ہمیں تلاش کیا ''لنھدینھم سبلنا'' ہم اُنہیں اپنی راہیں دکھا دیتے ہیں۔ جاھد و فینا کا معنی ہے ہماری طرف آنے کی کوشش کرنا، جاہدوعنا کا معنی ہے ہماری طرف سے دور جانے کی کوشش کرنا۔ سیدنا بایزید بسطامی علیہ الرحمہ اپنے عبادت وریاضت کے طویل سفر طے کرنے کے بعد افسوس کے ساتھ فرماتے ہیں کاش حبل الورید کی حقیقت سے میں پہلے آگاہ ہو جاتا تو ریاضت کی مشکلات سے بچ جاتا۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ خَلْقِهٖ

دنیا کا قرب خدا سے دوری ہے

محبوب حقیقی تک پہنچنے کیلئے دنیا کا پیار اس کی محبت بھی زبردست رکاوٹ ہے، مال ودولت کی حرص رب سے دوری کا سبب بن جاتی ہے قرآن مقدس فرماتا ہے ''الھٰکم التکاثر حتی زرتم المقابر'' تمہیں مال ودولت کی کثرت کی خواہش نے برباد کر دیا یہاں تک کہ اسی دھن میں قبروں میں چلے گئے۔ صوفیاء کہتے ہیں تھوڑی سی دنیا آخرت کے بہت سے بڑے بڑے کاموں سے محروم کر دیتی ہے دنیا کی محبت حق سے دوری کا سبب بنتی ہے، مال و دولت کی کثرت سے دل سے خدا خوفی سوز و گداز کے ختم ہونے کا شدید اندیشہ ہے۔ اسلام میں حسب ضرورت دنیا سے فائدہ اٹھانے کی مخالفت نہیں ''ربنا آتنا فی الدنیا حسنہ'' کا زریں اصول بیان فرمایا ہے، دنیا کا ایسا پیار جو خدا سے غافل کر دے اس سے نفرت کا درس دیا گیا ہے حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی اپنے دور کے ایک مشہور بزرگ عبیداللہ احرار کی زیارت کیلئے گئے اُن

بزرگوں کے ہاں مال و دولت کی فراوانی تھی، ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر واپس آ گئے فرمایا، ’’نہ مرد آنست کہ دنیا دوست دارد‘‘ وہ بندہ ولی نہیں ہوسکتا جو دنیا سے پیار رکھتا ہے، مولانا جامی فرماتے ہیں میں نے رات خواب میں قیامت کا منظر دیکھا، میرے نامہ اعمال میں کسی کے قرض کی ادائیگی باقی تھی جو میرے لئے پریشانی کا باعث بنی کہ یہ رقم کہاں سے لاؤں، وہی بزرگ خواب میں ملے اور فرمایا مولانا پریشان کیوں ہیں میں نے عرض کی حضور قرض دینا ہے مال ہے نہیں، تو فرمایا مولانا ہمارے کسی گھوڑے کی زین لے لیں اور قرض اتار دیں، بیداری ہو گئی شرمندگی کے ساتھ ان بزرگوں کے ہاں حاضری دی، ان بزرگوں نے فرمایا، مولانا آپ کل آئے تھے اور بغیر ملے واپس چلے گئے اور ایک فارسی کا مصرعہ کہا وہ تو سنائیں، مولانا جامی نے سنایا ’’نہ مرد آنست کہ دنیا دوست دارد‘‘ وہ مرد نہیں کہ جو دنیا سے پیار رکھتا ہے۔ حضرت عبیداللہ احرار نے فرمایا اگلا مصرعہ میری طرف سے ملا لیں اور شعر مکمل کر لیں ’’اگر دارد برائے دوست دارد‘‘ اگر دنیا کا مال دوست کیلئے رکھتا ہے تو حرج نہیں۔ مولانا رومی علیہ الرحمہ نے اس عنوان کو اپنے اس شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و روزی و فرزند و زن

فرماتے ہیں دنیا خدا سے غافل ہونے کا نام ہے، کاروبار اولاد بیوی بچے دنیا نہیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ خَلْقِهٖ

نفس کو ذبح کر دے

روحانیت کی ترقی اس کے عروج کیلئے یہ بھی ایک کامیاب عمل ہے کہ اپنے نفس کو ذبح کر دو، مولانا روم علیہ الرحمہ نے اس عظیم کام کیلئے نسخہ بتا دیا ہے فرماتے ہیں نماز میں اللہ اکبر کا نعرہ اس طرح بلند کر کہ تو اللہ رب العزۃ کے حضور قربانی دے رہا ہے ،اس عنوان کو اس شعر میں اس طرح بیان کیا۔

معنی تکبیر ایں ست اے امیم
کائے خدا پیش تو قربان شدیم

فرماتے ہیں تکبیر کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ ہم تیرے آگے قربان ہیں۔ بندے کا بارگاہ قدس میں اپنی انا، خودداری، کبر و غرور کو مٹا کر سر بسجود ہونا نفس کو ذبح کرنا ہے۔ نماز کی حالت میں بارگاہ قدس میں حاضری بے پناہ انوار و برکات کا سبب بنتی ہے، قیام کی حالت میں اس پر رحمت کی گھٹا چھا جاتی ہے، نیکیاں بارش کی طرح برستی ہیں، اس نمازی کو فرشتے چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ رب تعالیٰ کی تجلیات سامنے آجاتی ہیں۔ ایک فرشتہ کہتا ہے اے نمازی دیکھ تیرے سامنے کون آیا اور تو کس سے باتیں کر رہا ہے؟ یہ تجھے پتہ چل جائے تو قیامت تک نماز سے سلام نہ پھیرے اور اسی حالت میں مر جائے، پنجگانہ نماز کی ادائیگی بھی روحانی پرواز کیلئے کامیاب نسخہ ہے۔ افسوس ہے ہم سستی کرتے ہیں، اللہ اکبر کہہ کر نفس کو ذبح کرنے کے عنوان کو ایک اور جگہ پر اس طرح فرمایا،

گوئی اللہ اکبر و آں شوم را

سر ببر تاوا رہد جاں از فنا

فرماتے ہیں جیسے تم جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ اکبر کہتے ہو، نفس کو ذبح کرتے وقت بھی نماز کی ادائیگی میں یہ کہہ کر نفس کو کچل دو کہ جان بچ جائے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ بِعَدَدِ خَلْقِہٖ

یکے از خدام صوفیاء

ابوالنصر منظور احمد

جامعہ فریدیہ ساہیوال

۲۰۱۵-۰۶-۱۶